قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1982

اس پرچہ میں :-

محشرستان فلسطین

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ

بدلِ اشتراک	ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ
سالانہ ستان -/۳۶ روپے ممالک -/۸۶ "	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور ۱۱	۳ تین روپے
جلد ۳۵	ستمبر ۱۹۸۲ء	شمارہ ۹

فہرست

۱۔ لمات ... (عبوری دور کے احکام کی حیثیت) ... ۲

۲۔ یہ وہ سحر تو نہیں! ... (یومِ آزادی پر پرویز صاحب کا درس) ... ۹

۳۔ قرآنک کالج کے متعلق ضروری اعلان ... (چیئرمین قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ... ۳۰

۴۔ فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ... ۳۲

۵۔ حقائق و غیر ... ۳۳

۶۔ قرآنی درس کے اعلانات ... ۳۷

۷۔ قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟ ... (قسط ۲) ... ۳۸

۸۔ محشرستانِ فلسطین ... (قسط اوّل) ... ۴۹

۹۔ "تصوف کی حقیقت" ... ۶۴

مدیر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت۔ ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ۔ اشرف پرنٹنگ پریس۔ ۹ ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(پرویز صاحب کے درسِ قرآنِ مجید پر مبنی)

قرآنِ مجید میں بے شمار مقامات پر مفلسوں۔ ناداروں۔ حاجتمندوں۔ غریبوں۔ بھوکوں کی مدد کرنے کے احکام آئے ہیں۔ کہیں ترغیب اور تلقین کی شکل میں۔ اور کہیں تاکید اور احکام کی صورت میں۔ ظاہر ہے کہ یہ امداد دولتمندوں کی طرف سے کی جائیگی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن کریم اسلامی معاشرہ یا نظام میں ان دونوں طبقوں کا وجود ضروری قرار دیتا ہے۔ یعنی ناداروں (HAVES) اور دولتمندوں (HAVE-NOTS) کا وجود۔ اور چونکہ قرآن کریم تا قیامِ نوعِ انسان کے لئے ابدی ضابطۂ حیات ہے اس لئے یہ واضح ہے کہ وہ اس طبقاتی تقسیم کو پوری عالمِ انسانیت کے لئے۔ اور ہمیشہ کے لئے ناگزیر قرار دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ) قرآن کریم بنی نوع انسان کو دو طبقوں میں تقسیم کرتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کا وجود لازمی قرار دیتا ہے۔ (یعنی) وہ کہتا یہ ہے کہ دنیا میں غریب اور نادار بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور امراء اور مرفہ الحال بھی۔ مرفہ الحال لوگوں کا فرض ہوگا کہ وہ صدقہ خیرات زکوٰۃ کے ذریعے ان کی مدد کریں۔

اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن کریم عالمگیر انسانیت کے لئے مستقلاً اسی قسم کا معاشی (بلکہ معاشی اور معاشرتی) نظام تجویز کرتا ہے تو یہ نظام ایسا نہیں جسے ہم دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کر سکیں۔ یہ نظام سرمایہ داری کی سنگین ترین شکل ہے جسے اب دنیا کی سرمایہ داری نظام کی حامل قومیں بھی، رفتہ رفتہ چھوڑتی چلی جاتی ہیں۔ وہ نہ بھی چھوڑیں تو بھی قرآن تکریمِ انسانیت کا جو تصور پیش کرتا ہے اس کی روشنی میں خیرات پر مبنی نظام وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ خیرات دینے والے کے اندر احساسِ برتری (SUPERIORITY COMPLEX) پیدا ہوتا ہے۔ اور لینے والے کے اندر احساسِ کمتری۔ اس سے اس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ اور اگر یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک قائم رہے تو اس کے دل سے عزتِ نفس کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے اور وہ عادی گداگر بن جاتا ہے۔ احساسِ کہتری ہو یا کمتری، دونوں نفسیاتی امراض ہیں۔ قرآن اپنے آپ کو نفسیاتی امراض کا معالج قرار دیتا ہے۔ اس لئے وہ خود ہی ان امراض کا موجب کیسے بن سکتا ہے؟ اور وہ بھی ہنگامی طور پر نہیں بلکہ مستقلاً۔ (اس تصور کی رو سے) وہ ان امراض کو لاعلاج قرار دیتا ہے، (العیاذ باللہ) خود خدا کے پیدا کردہ۔ جب یہ کہا جائے کہ منشائے خداوندی یہ ہے کہ غریب بھی پیدا ہوتے رہیں اور امیر بھی۔ اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے (بالخصوص جب اس کے ساتھ یہ بھی عقیدہ وابستہ ہو کہ رزق کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے بافراط دولت دے دیتا ہے۔ جسے چاہے نادار اور محتاج رکھتا ہے) تو ان طبقات کے مٹانے (حتیٰ کہ ان میں اصلاح) کا تصور تک بھی خدا کے مقابل

محاذ قائم کرنے کے مرادف ہوگا۔ یہ تو ہندوؤں کا وہ نظام ہوگا جس کی رُو سے (ان کا) عقیدہ یہ ہے کہ برہمن، کھشتری، ویش، شودر سب برہما کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ انسانوں کی یہ پیدائشی تفریق نہ مٹائی جا سکتی ہے نہ پامال شودروں کی حالت سدھارنے کی کوشش کی جا سکتی۔ ایسا کرنا برہما کے منشا کے خلاف ہوگا۔

یہ ہوتا نتیجہ اس عقیدہ کا کہ قرآن مجید میں جو غریبوں، ناداروں، محتاجوں کی مدد کرنے کے احکام آئے ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ غریبوں اور دولتمندوں کے طبقات کو مستقل طور پر قائم رکھنا چاہتا ہے۔

اب آئیے دوسری طرف۔ قرآن کریم ناداری اور محتاجی (بھوک) کو خدا کا عذاب قرار دیتا ہے (۱۶/۱۱۲) اور رزق کی تنگی کو قوانینِ خداوندی سے اعراض برتنے کا نتیجہ (۲۰/۱۲۴) اور دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی کا باعث۔ دوسری طرف وہ دولت جمع کرنے والوں کو سنگین ترین جرم کا مرتکب قرار دیتا ہے اور اس کا نتیجہ جہنّم کا عذاب۔ یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے سے متضاد تھیں یعنی ایک طرف وہ غریبوں اور محتاجوں کو ہمدردی کا مستحق ٹھہراتا ہے اور دوسری طرف وہ ناداری اور مفلسی کو خدا کا عذاب قرار دیتا ہے۔ ایک طرف وہ دولتمندوں کو تلقین کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ وہ غریبوں اور ناداروں کی مدد کریں اور اسے اجرِ عظیم کا موجب قرار دیتا ہے اور دوسری طرف وہ دولت جمع کرنے کو جہنّم کے عذاب کا مستوجب بتاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس (بظاہر) تضاد کا حل کیا ہے، اور قرآن کریم کس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے؟

(۰)

قرآن حلیم اور نظام کا لفظ، ماسکہ اور ملخص تکریمِ انسانیت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ اس نے تمام انسانوں کو واجب التکریم پیدا کیا ہے (۱۷/۷۰) اس تکریم کا اثبات اور استحکام، قرآن کا مطلوب و مقصود اور غایت و منتہیٰ ہے۔ تکریمِ انسانیت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ نہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو، نہ کسی کا محتاج۔

محکومیت کا گوشہ، سردست ہمارے زیرِ غور نہیں (اگرچہ اس موضوع پر طلوعِ اسلام کے صفحات بھرے پڑے ہیں)۔ اس وقت ہم صرف محتاجی کے موضوع تک محدود رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو غریب پیدا کرتا ہے، نہ امیر۔ تمام انسانی بچے یکساں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ رزق (سامانِ زیست یا دولت) کی غلط (ناہموار) تقسیم ہے جس سے امیر اور غریب کے طبقات وجود میں آتے ہیں۔ قرآن کریم کا مقصود (انسانوں کی اس خود ساختہ) ناہموار تقسیم کو مٹا کر اس کی جگہ ہموار تقسیم کو نافذ کرنا ہے۔ ہموار تقسیم سے مراد یہ ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی (نہایت باعزت طریق سے) پوری ہوتی رہیں۔ نہ کسی کے پاس اس کی ضروریات سے زائد کچھ ہو، نہ کسی کی کوئی ضرورت رُکی رہے۔

اس مقام پر (ضمناً) ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ جب مساواتِ انسانیہ کا ذکر کیا جائے تو بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہر شخص کو (مثلاً) ایک ایک من آٹا دیا جائے گا۔ یا ہر شخص کے پاس دس دس ہزار روپیہ ہوگا۔ مساوات کا یہ مفہوم ہمارا خود ساختہ ہے۔ اس قسم کی مساوات، جیل خانے کی ہے جس میں ہر قیدی کو دو دو روٹیاں دی جاتی ہیں، بلا لحاظ اس امر کے کہ کسی قیدی کی بھوک کتنی روٹیوں کی ہے۔ قرآنی مساوات سے مراد ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی کا پورا ہونا ہے۔ اس میں سوال مقدار کا نہیں، حاجت روائی کا ہے۔

بہرحال قرآن کا مقصود و منتہیٰ اس قسم کی تقسیم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایسی تقسیم انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ یہ صرف

ایک اجتماعی نظام کی رو ہی سے ممکن ہے جس میں ہر شخص اپنی ضروریات سے زائد (سامانِ زیست یا دولت) اس نظام کے سپرد کر دے، اور وہ نظام اس سے ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرے۔ واضح رہے کہ قرآنی نظام میں یہ زائد از ضرورت دولت کسی سے چھینی نہیں جائیگی۔ افرادِ مومنین اسے بطیبِ خاطر اپنے نظام کے حوالے کر دیں گے۔

ظاہر ہے کہ نہ تو قرآن ہی پورے کا پورا ایک رات میں نازل ہو گیا تھا۔ نہ ہی یہ نظام ستما شب قائم ہو گیا تھا قرآن تئیس سال تک بتدریج نازل ہوتا رہا، اور یہ نظام بھی آہستہ آہستہ استوار ہوتا رہا۔ (تاریخی معلومات کی رو سے) یہ نظام عہدِ فاروقی تک تکمیل تک پہنچا تھا جب حضرت عمرؓ نے اعلان کیا تھا کہ (کوئی انسان تو ایک طرف) "اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی" اور کہا تھا کہ سربراہِ مملکت گیہوں کی روٹی اس وقت کھا سکتا ہے جب اسے یقین ہو کہ امت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ قرآن کا نزول اس معاشرہ میں ہوا جو انتہائی سرمایہ دارانہ تھا۔ اس میں امیر اور غریب کی طبقاتی تقسیم بڑی سنگین تھی حضورؐ کی دعوتِ انقلاب کا آغاز اسی معاشرہ سے ہوا اور اسی میں سے سعادتمند افراد نے اس آواز پر لبیک کہا اگرچہ اس کی رفتار ابتداءً بڑی سست تھی) اس میں امیر بھی شامل تھے (گو بہت کم) اور غریب بھی (جن کی اکثریت تھی) غریب اور نادار افراد کی امداد ضروری تھی۔ اس مقصد کے لئے مرفہ الحال افراد کی زائد از ضرورت دولت چھینی نہیں جا سکتی تھی انہیں ترغیب و تلقین ہی سے اس کے لئے مائل کیا جا سکتا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں انفرادی امداد (صدقہ خیرات وغیرہ) کے احکام نازل ہوئے تھے۔ قرآن نے اس "سرمایہ دارانہ نظام" کو کچھ وقت کے لئے گوارا تو کر لیا کہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا، لیکن اس کا ڈنک نکال دیا۔ اس نے صدقہ و خیرات دینے والوں کی یہ کہہ کر ذہنیت بدل دی کہ تم جس کی مدد کرو اس سے کہہ دو کہ یہ تم پر ہمارا احسان نہیں۔ ہم اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ تو ایک طرف شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں (۹/۷۶) اور لینے والوں سے یہ کہہ کر ان کا احساسِ کمتری ختم کر دیا کہ تم ان سے کچھ بطور خیرات نہیں لے رہے۔ تم اپنا حق وصول کر رہے ہو (۵۱/۱۹) یہ تمہاری ہی دولت ہے جو تمہیں واپس مل رہی ہے۔ اور دولت مندوں سے یہ کہہ کر زائد از ضرورت دولت کو غیر مؤثر اور غیر جاذب بنا دیا کہ تم اگر کسی کو کچھ قرض دو (خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو) تو تم صرف اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ اس سے زیادہ جو کچھ لوگے وہ ربٰو ہو گا جو خدا اور رسول کے خلاف بغاوت کے مترادف ہو گا۔ (فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۲/۲۷۹) ضمناً آج ہمارے ہاں کمیٹیاں بٹھائی جاتی ہیں یہ متعین کرنے کے لئے کہ سود کی (DEFINITION) کیا ہے؟ قرآن نے ان تین لفظوں میں اسے متعین کر دیا کہ ربٰو کسے کہتے ہیں۔ یعنی اصل زر سے زائد جو کچھ بھی ہے وہ ربٰو ہے، خواہ وہ کہیں سے حاصل ہو اور کسی سے لیا جائے۔ اس سے بینک کے "سود"..... کاروباری منافع (مضاربت)۔ زمین کی بٹائی یا کرایہ (مزارعت) وغیرہ کی سب بحثیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ سب منافع ربٰو کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دولت جمع کرنے کے خلاف تنبیہات کے احکام بھی نازل ہوتے رہے۔

اس طرح یہ اصلاحی اقدامات آگے بڑھتے گئے تاآنکہ وہ نظام قائم ہوگیا جس میں تمام افرادِ معاشرہ کو مخاطب کر کے کہہ دیا کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ... (۶/۱۵۲) "ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں، اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی"۔ اور دوسری طرف ان لوگوں سے جن کے پاس زائد از ضرورت دولت (یا سامانِ زیست) تھا کہہ دیا کہ یہ زائد از ضرورت، مملکت کے سپرد کر دو تاکہ وہ نظامِ ربوبیت کو بروئے کار لا سکے (۲/۲۱۹)۔ یہ تھی اس نظام کی انتہائی (اور مکمل) شکل جس میں امیر اور غریب کی طبقاتی تقسیم اور تفریق ختم ہوگئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس نظام کے قائم ہو جانے کے بعد، وہ تمام احکام جو اس دور میں نازل ہوئے تھے جب یہ اپنے تکمیلی مراحل میں سے گذر رہا تھا، کالعدم یا منسوخ نہیں بلکہ ساقط العمل یا معطل قرار پا گئے۔ ان احکام کے منسوخ نہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی معاشرہ میں ایسی صورت ہو جیسی عربی معاشرہ میں نزولِ قرآن کے وقت تھی، اور وہ قرآنی نظام قائم کرنا چاہے (جیسا کہ اس وقت ہماری حالت ہے) تو وہ اس تدریجی طریق سے منتہیٰ تک پہنچ جائے۔ ان احکام کو عبوری دور کے احکام کہا جاتا ہے۔ جیسے جب پانی نہ ملے تو تیمّم کا حکم نافذ العمل ہو جاتا ہے اور پانی ملنے پر ساقط العمل۔

——— (٠) ———

قرآن کا یہ معاشی نظام صدرِ اوّل تک جاری رہا۔ اس کے بعد ملوکیت آگئی اور اس نے نظام سرمایہ داری کو بصورت قائم کر دیا۔ ایسا کرنے میں، ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ قرآن کے وہ احکام تھے جن میں دولت جمع کرنے کو سنگین جرم اور عذابِ جہنّم کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کی رکاوٹیں، وضعی روایات کی رُو سے دور کر لی جاتی تھیں..... (مثلاً) سورۃ توبہ میں ہے:۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ۝ (۹/۳۴-۳۵)

جو لوگ چاندی اور سونا (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے، اے رسول! تم اعلان کر دو کہ وہ ایک الم انگیز عذاب میں ماخوذ ہوں گے۔ اس دن ان کے چاندی اور سونے کے ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور پھر ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائیگا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے مختص کر رکھا تھا۔ آج تم اپنے خزانہ سے پیدا ہونے والے عذاب کا مزہ چکھو۔

دولت جمع کرنے کے خلاف اگر قرآن کریم میں متعدد دیگر آیات نہ بھی ہوتیں، تو بھی یہ ایک آیت نظامِ سرمایہ داری کو ختم کر دینے کے لئے کافی تھی۔ لیکن اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت وضع کر لی گئی۔

> حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا، پس عمرؓ، رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپؐ کے صحابہؓ پر گراں گذری ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر حضرت عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔
>
> (مشکوٰۃ ..... کتاب الزکوٰۃ)

یہ روایت زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ یہ وضعی ہے۔ لیکن جس مقصد کے لئے یہ وضع کی گئی تھی اس نے وہ مقصد پورا کر دیا۔ یعنی اس سے نظامِ سرمایہ داری کے احیاء کے لئے سند ہاتھ آگئی۔ اس سے وہ تمام آیات جن میں دولت جمع کرنے کے خلاف سخت وعید آئی ہے، منسوخ قرار پا گئیں، کیونکہ جب جمع شدہ دولت میں سے اڑھائی فی صد زکوٰۃ نکال کر بقایا دولت کو پاک کر لیا جائے تو مال جمع کرنے کی ممانعت ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف اس اڑھائی فی صد روپیہ کو بطور خیرات بانٹنے کے لئے محتاجوں اور ناداروں کا وجود لابدی ہو گیا۔ قرآن کی وہ آیات جو عبوری دور میں انفرادی امداد کے لئے نازل ہوئی تھیں، انہیں مستقل احکام قرار دے کر زکوٰۃ نکالنے کی تلقین کے لئے بطور سند پیش کیا جانے لگا۔ زکوٰۃ (جو خیرات ہی کا دوسرا نام تھا) کے فقہی مسائل مرتب ہونے لگے۔ دورِ ملوکیت میں وضع کردہ یہی نظامِ سرمایہ داری اسلام کا معاشی نظام قرار پا گیا۔ اسی نظام کو اب یہاں اسلامی نظام کے نام سے قائم کیا جا رہا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر اسلام کا منشاء یہ ہوتا کہ غریبوں اور ناداروں کا وجود نہ رہے، تو قرآن میں ان کا ذکر کیوں آتا اور انہیں صدقہ خیرات دینے کے احکام کیوں دیئے جاتے! آپ نے غور فرمایا کہ ایک وضعی روایت نے کس طرح سارے قرآن کو الٹا کر رکھ دیا! اس کی رُو سے امیروں اور غریبوں کی طبقاتی تفریق اور نظامِ سرمایہ داری کو مستقلاً خدائی سند حاصل ہو گئی۔ یعنی دولت کی غلط تقسیم سے ایک طرف چند افراد کے ہاں دولت کے انبار در انبار جمع ہوتے رہیں، اور دوسری طرف مفلسوں اور ناداروں کے ہجوم پیدا کرتے رہیں۔ اور پھر دولت مندوں سے کہو کہ وہ صدقہ اور خیرات سے ان کی مدد کریں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہودی ایسا ہی کچھ کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے اور جب دوسرے لوگ ان خانماں خراب لوگوں کو گرفتار کر لیتے تو صدقہ خیرات سے ان کا فدیہ

دے کر انہیں چھڑا لیتے اور سمجھتے کہ انہوں نے بڑا نیک کام کیا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی اس غلط روش کی سخت مذمت کی ہے (۴/۹۵) یہی حالت ہماری ہے۔ دولت کی غلط تقسیم سے ہم پہلے لوگوں کو مفلس اور نادار بنا دیتے ہیں اور پھر صدقہ اور خیرات سے ان کی مدد کر کے جنت میں گھر خرید لیتے ہیں!

(۰)

قرآن میں اس قسم کی بے باکانہ تحریف، نظامِ معیشت کے سلسلہ میں ہی نہیں ہوئی۔ ملوکیت کو جہاں جہاں بھی ضرورت پیش آئی، اس نے یہی کچھ کیا۔ (مثلاً) قرآن کریم، غلامی کی انسانیت سوز رسم کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت، باقی دنیا کی طرح، عرب معاشرہ بھی غلاموں اور لونڈیوں سے پٹا پڑا تھا۔ محنت کشی کے تمام کام غلام کرتے تھے اور لونڈیاں جنسی اختلاط کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ نہ ان کی تعداد پر کوئی پابندی تھی، نہ (رسمی ہی سہی) نکاح کی ضرورت۔ انہیں دوسروں کو تحفتہً بھی دیا جاتا تھا۔ فروخت بھی کیا جاتا۔ قرآن نے..... اس معاشرہ سے غلامی کو ختم کرنا تھا۔ غلاموں اور لونڈیوں کا بنیادی سرچشمہ جنگ کے قیدی تھے۔ یعنی جنگ میں گرفتار شدہ مردوں کو غلام بنا لیا جاتا اور عورتوں کو لونڈیاں۔ اس کے بعد وہ مستقلاً غلام اور لونڈیاں ہی رہتے، حتیٰ کہ ان کی اولاد بھی۔

قرآن کریم نے ایک ہی حکم سے غلامی کے اس سرچشمہ کو بند کر دیا۔ اس نے جنگی قیدیوں کے متعلق کہا کہ انہیں رہا کیا جائے گا۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً..... (۴۷/۴) دشمن سے ان کا فدیہ لے کر۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو احسان کے طور پر۔ انہیں بہرحال رہا کرنا ہوگا۔" انہیں غلام اور لونڈیاں نہیں بنایا جائے گا۔

یہ تو رہا آئندہ کے لئے اس سرچشمہ کا بند کرنا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جن غلاموں اور لونڈیوں سے سارا معاشرہ معمور تھا انہیں کیا کیا جائے؟ انہیں رہا کر دینے سے نہ صرف معاشرہ کا سارا نظام تلپٹ ہو جاتا بلکہ یہ غلام اور لونڈیاں خود بھی مصیبت میں پھنس جاتے۔ وہ اتنی تعداد میں جاتے کہاں اور کھاتے کہاں سے؟ قرآن کریم نے ان کے متعلق ہدایات دیں کہ انہیں سطحِ انسانیت پر لا کر معاشرہ کا مفید جزو بنایا جائے۔ مختلف لغزشوں کے کفارہ کے طور پر انفرادی طور پر غلاموں کو رہا کرنا۔ ان میں سے جو اپنی روزی کمانے کے قابل ہوں ان کی مالی امداد کر کے انہیں کسبِ معاش کے قابل بنا دینا۔ تکریمِ انسانیت کی جہت سے ان میں اور آزاد افراد میں کوئی فرق نہ کرنا۔ لونڈیوں کو بیوی کا درجہ دینا اور ان کے بچوں کو جائز اولاد تصور کرنا۔ یہ اور اس قسم کے دیگر احکام جن سے مقصود یہ تھا کہ یہ "جنسِ فرومایہ" یا آزاد ہو جائے یا معاشرہ کا جزو بن جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل بھی بتدریج تکمیل تک پہنچا تھا۔ جب یہ اس طرح جذب ہو گئے تو اس معاشرہ سے غلامی کا خاتمہ

ہوگیا (کیونکہ اس کا سرچشمہ پہلے ہی بند کر دیا گیا تھا)۔ اس کے بعد یہ عبوری دور کے احکام بھی ساقط العمل قرار پا گئے۔

لیکن ملوکیت نے اس انسانیت سوز رسم کو پھر سے زندہ کرنا چاہا تو قرآن کی مذکورہ بالا آیت ان کے آڑے آئی۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے فقہ نے یہ فتویٰ دے دیا کہ جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں کو کفارہ یا فدیہ لئے کر یا احساناً رہا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور غلام اور لونڈیاں بھی بنایا جا سکتا ——— اس آخری راہِ جواز سے معاشرہ میں غلاموں اور لونڈیوں کے بھاٹک کھل گئے۔ آپ دورِ عباسیہ کی تاریخ دیکھئے۔ ایک ایک خلیفہ کے حرم میں ہزاروں لونڈیاں نظر آئیں گی۔ دارالخلافہ میں ایک خاص منڈی دکھائی دے گی جہاں لونڈیاں نیلام ہوتی تھیں۔ ہماری کتبِ فقہ لونڈیوں سے متعلق احکام و فتاویٰ سے بھری پڑی ہیں، اور ان کی تائید میں قرآن کی وہ آیات پیش کی جاتی ہیں، جو عبوری دور میں نازل ہوئی تھیں۔ انہیں مستقل احکام قرار دے کر دھڑلے سے کہا جاتا ہے کہ ہم آج بھی دشمن کی گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اس باب میں پیش پیش تھے۔ (تفصیل ان امور کی ادارہ کی طرف سے شائع شدہ کتابچہ ——— غلام اور لونڈیاں ——— میں مل سکے گی) ——— انہی "مستقل" احکام کی رُو سے، پاکستان کی سابقہ حکومت کے دور میں، پارلیمنٹ میں ایک مولوی صاحب نے حکومت سے کہا تھا کہ کم از کم ایک ایک لونڈی رکھنے کی تو اجازت دیدی جائے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان وضعی روایات اور فقہی احکام سے کس طرح اسلام کو مسخ اور قرآن کو محرف بنایا گیا۔ اب یہی اسلام پاکستان میں نافذ کیا جا رہا ہے۔

یاد رکھئے! صحیح اور سچا اسلام وہی ہے جسے قرآنِ خالص کی تائید حاصل ہو۔ اگر بایں ترسیدی، تمام بولہبی است۔ لیکن یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ "صرف اور صرف قرآن" کو اتھارٹی قرار دینے کے دعویدار بھی جب عملاً اسلام پیش کرتے ہیں تو وہ انہی روایات اور فقہی احکام کا مرتب کردہ اسلام ہوتا ہے۔ یہ لوگ سادہ لوح اُمّت کے لئے زیادہ فریب دہی کا موجب ہوتے ہیں۔ اقبالؒ نے اسی مقام پر روحِ محمدؐ کو پکار کر کہا تھا کہ

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

اسے یاد رکھئے! (۱) منی آرڈر فارم کے نیچے اور اس کی پشت پر آپ اپنا نام اور پورا پتہ، ضرور لکھئے اور اس طرح لکھئے کہ وہ آسانی سے پڑھا جا سکے۔ اس سے ہمیں حساب رکھنے میں آسانی ہوگی اور آپ کے حساب میں کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہوگی۔

(۲) کسی ماہ کا پرچہ نہ ملنے پر، سارا غصہ ادارہ طلوعِ اسلام پر نہ نکالا کریں۔ آپ کے اور ادارہ کے درمیان ایک اور کڑی بھی ہے۔ اور وہ ہے ڈاک خانے کا نظام۔ یہاں سے ہر پرچہ چیک کر کے انتہائی احتیاط سے بھیجا جاتا ہے۔ ادارہ اتنا ہی کر سکتا ہے۔ متعلقہ ماہ کی پندرہ تاریخ تک پرچہ نہ ملے تو ادارہ کی طرف اطلاع دیدیں۔ پرچہ (بشرطِ موجودگی) آپ کو بھیج دیا جائے گا۔ شکریہ

——— (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

باسمہٖ تعالیٰ

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا ......

یہ وہ سحر تو نہیں!

یوم آزادی کی تقریب منعقدہ ۱۳؍ اگست ۸۲ء
پر محترم پرویز صاحب کا خصوصی درس

باسمہٖ تعالیٰ

یہ وُہ سحر تو نہیں!

پرویزؔ

"پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔
اس لئے اس میں اسلام نافذ ہونا چاہیئے!"

یہ نعرہ آپ کو ہر محراب و منبر ہی سے نہیں، ہر پلیٹ فارم اور اسٹیج سے، بلکہ ہر گلی کوچے سے سنائی دے گا۔ لیکن یہ نعرہ جس قدر حقیقت و صداقت پر مبنی ہے جس طرح اسے (EXPLOIT) کیا گیا ہے، وہ اتنا ہی اس کی صداقت و حقیقت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دینے کا موجب ہے۔ پاکستان جس تشتت و انتشار کا شکار ہو رہا، اور جس طرح بے یقینی اور عدم اطمینان کا صید زبوں بن رہا ہے، وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

جو حضرات تحریکِ پاکستان کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ مطالبۂ پاکستان کی اوّلین مخالفت ہندو (کانگریس) کی طرف سے ہوئی تھی۔ ان کی یہ مخالفت قابلِ فہم تھی۔ وہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام، مسلمانوں سے لینا چاہتے تھے اور اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اس آبادی کا اتنا بڑا حصہ، نہ صرف یہ کہ ان کے پنجۂ استبداد سے رہا ہو جائے، بلکہ ان کے مدّمقابل ایک آزاد مملکت قائم کر لے۔ مسلمان لیڈروں میں سے جو سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے وہ بھی اس مخالفت میں ہندو کے ہم نوا تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اور شدید مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی جو مذہبی پیشوا یا علماء کہلاتے تھے۔ ان میں سے معدودے چند ایسے تھے جنہوں نے اس مطالبہ کی تائید کی لیکن باقی سب اس کے شدید مخالف تھے۔ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ (بالفاظِ دیگر مسلم لیگ) کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں، جہاں اسلام کی حکمرانی ہو۔ دوسری طرف، یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ علماء حضرات بھی اسلام ہی کے مدعی تھے۔ نظر بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ فریق دو مختلف گروہوں میں اختلاف کیوں تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی طرف سے اس مطالبہ کی اس قدر شدید مخالفت کیوں کی گئی تھی۔ چونکہ ہمارے ہاں نہ تو تحریکِ پاکستان کی کوئی ایسی تاریخ مدوّن ہوئی ہے نہ قائدِ اعظمؒ کی کوئی سوانح عمری جس میں ان دو گروہوں کے باہمی اختلاف کی

مطالبۂ پاکستان

تصادم و تزاحم کی اصل وجہ بنیاد کو واضح طور پر سامنے لایا گیا ہو۔ اس لئے ہمارے عوام کی بالعموم اور نئی نسل کی بالخصوص سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نزاع کا بنیادی سبب کیا تھا۔ اور یہ سبب اب مملکت میں تشتت و انتشار کا موجب کس طرح بن رہا ہے۔ میں نہ صرف اس جنگ کا عینی شاہد ہوں بلکہ اس میں عملاً شریک بھی تھا، اور ان دونوں گروہوں کے نزاع میں علماء کے خلاف محاذ میں میں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس لئے مجھے معلوم ہے کہ اس نزاع اور مخالفت کا اصلی سبب کیا تھا۔ اسی لئے میں وقتاً فوقتاً اس پر روشنی ڈالتا چلا آرہا ہوں۔ آج بھی میرے خطاب کا مرکزی موضوع یہی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان بھی اسلام پر مبنی تھا، اور علماء حضرات بھی اپنی مخالفت کو اسلام ہی کا تقاضا قرار دیتے تھے۔ لیکن ان دونوں میں اختلاف کا باعث ان کا، اسلام کا الگ الگ تصور تھا۔ اور یہ ہر دو تصورات باہم دگر اس قدر متضاد تھے کہ ان میں مفاہمت کی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک ان تصورات کی کنہ و حقیقت کو نہ سمجھ لیا جائے، نہ ان دونوں گروہوں کی کشمکش کی علت سمجھ میں آسکتی ہے، نہ ہی پاکستان کے تشتت و انتشار کی حقیقی وجہ۔ اس اعتبار سے آپ اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

(۰)

حقیقی اسلام کا تصور

اسلام (جسے الدین کہہ کر پکارا گیا ہے) حضور نبی اکرم کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوا، اور اسے قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا۔ اس اسلام کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں:-

(۱) اسلام، (مذہب کی طرح) خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں، یہ ایک نظامِ حیات ہے جس کی عملی تشکیل کے لئے آزاد مملکت کا وجود لابدی ہے۔

(۲) اس مملکت میں حقِ حکومت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حاصل نہیں ہوتا۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ اس کی کتاب (قرآن کریم) کی حکمرانی ہے۔ لہٰذا، اسلام نظام ہے قرآن کی حکمرانی کا۔

(۳) قرآن میں (بجز معدودے چند احکام) زندگی کے ہمہ گیر اصول دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کو کس طرح بروئے کار لایا جائے گا، اسے امتِ مسلمہ باہمی مشورہ سے طے کرے گی۔ لہٰذا، اسلامی مملکت اس تنظیم کا نام ہے جس کی رو سے، امت باہمی مشورہ سے، قرآنی اصول و اقدار کو عملاً نافذ کرنے کا فریضہ سرانجام دیگی۔ یہ اصول و اقدار ابدی اور غیر متبدل ہیں لیکن انہیں نافذ کرنے کے طور طریق جنہیں امت، باہمی مشورہ سے طے کرے گی، عندالضرورت بدلتے رہیں گے۔ اسلامی مملکت اس ثبات اور تغیر ..... (PERMANENCE & CHANGE) کے حسین امتزاج کا نام ہے۔

(۴) ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس مملکت میں ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ تو کجا، مغربی انداز کی جمہوریت بھی نہیں ہوگی جس میں حقِ حکومت ایک فرد کے بجائے، افراد کے گروہ کو حاصل ہوتا ہے۔ نہ ہی اس میں مذہبی پیشوائیت

کا وجود ہوگا کیونکہ اس میں "سیاست اور مذہب" الگ الگ شعبے نہیں ہوں گے۔ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے جو فیصلے مملکت کرے گی، وہی شریعتِ اسلامی کے احکام کہلائیں گے۔

(۵) ان خصوصیات کے باوجود، مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں ہوگا۔ مملکت، انسانیت سے متعلق بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوگی۔ ان مقاصد کی فہرست طویل ہے لیکن اس میں سرِ فہرست حسبِ ذیل امور آتے ہیں:۔

مقاصد

(i) قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، ہر شخص کو پوری پوری آزادی ہوگی۔

(ii) ہر انسان یکساں طور پر واجب التکریم ہوگا۔ تذلیلِ انسانیت سنگین ترین جرم ہوگا۔

(iii) کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں ہوگا۔ اس طرح نہ کوئی فرد کسی دوسرے کا محتاج ہوگا نہ محکوم۔ اس سے نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(iv) تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کے وسائل و ذرائع یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔

(v) کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔

یہ تھی وہ اسلامی مملکت جو ہماری تاریخ کے صدرِ اوّل میں قائم ہوئی۔ اور ہر ایک نے اُسے، اس کے درخشاں انسانیت ساز نتائج سے جان اور پہچان لیا۔

اسے صدرِ اوّل کا حقیقی اسلام کہا جائے گا۔

---(o)---

صدرِ اوّل کے بعد

صدرِ اوّل کے اس اسلام کا دور جلدی ختم ہو گیا۔ اس کے خلاف سب سے پہلا اور شدید ترین حملہ ملوکیت کی شکل میں نمودار ہوا جس نے حقیقی اسلام کی جڑ بنیاد کو اکھیڑ کر رکھ دیا۔ آسمان کی آنکھ نے جہاں اس انقلاب کی مثال کہیں نہیں دیکھی تھی جو صدرِ اوّل کی اسلامی مملکت نے رونما کیا تھا، وہاں اس نے اس رجعتِ قہقری (الٹے پاؤں پلٹ جانے) کی بھی مثال نہیں دیکھی تھی جس کا مظاہرہ صدرِ اوّل کے بعد اسی امت نے کیا تھا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست　　خود سرِ تختِ ملوکیت نشست!
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت　　دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر!
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر
(جاوید نامہ ص۸۵)

دورِ ملوکیت کا اسلام

ملوکیت جابرانہ تغلّب سے برسرِ اقتدار تو آگئی لیکن امت کو اسلام سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس کے لئے ملوکیت کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کے اس تقاضا کو بھی پورا کیا جائے۔ اس کے لئے اس نے ثنویت (DUALISM) کا راستہ اختیار کیا۔ یعنی امورِ سیاست تو اپنے قبضے میں رکھے اور "شرعی معاملات" مذہبی پیشواؤں کے سپرد کر

دیئے۔ اس سے دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ عباسی سلاطین خود تو نسلی اعتبار سے عرب تھے لیکن ان کی سیاست، ثقافت، فلسفہ، نظریات، تصورات سب پر ایرانی فضا مسلط تھی۔ اس لئے اس دور میں اسلام کے نام سے جو تہذیب وجود میں آئی اور جو مذہب مرتب ہوا وہ سب ایرانی تصورات سے متاثر تھا۔ اقبال اس اسلام کو "عجمی اسلام" کہہ کر پکارتا ہے۔ کیا یہ حقیقت حیرت انگیز نہیں کہ (شیعوں کی تو ایک طرف رہے) خود سنّیوں کی احادیث کے چھ کے چھ صحیح ترین مجموعوں کے مرتب کرنے والے ایرانی تھے۔ اسلام کی سب سے پہلی مفصّل تاریخ مدوّن کرنے والا ایرانی تھا۔ سب سے پہلی مبسوط تفسیر لکھنے والا ایرانی تھا۔ انہی احادیث، تفسیر اور تاریخ پر ہمارے مروّجہ اسلام کی بنیاد ہے۔ اسی اسلام کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے کہ :-

تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام　　بتانِ عجم کے پجاری تمام　　(بالِ جبریل ص۱۶۸)

ہماری تاریخ کے بڑے بڑے جلیل القدر علماء و مشائخ جن کے نام، علامِ ورحمت کے ساتھ لئے جاتے ہیں، اسی دورِ ملوکیت کے تھے۔ (جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی ایک بار عرض کیا تھا) یہ حقیقت عجیب تحیر انگیز ہے کہ یہ حضرات یزید کے خلاف سنگین ترین جرم یہ عائد کرتے ہیں کہ اس نے ملوکیت کی بنیاد رکھی اور اس طرح اسلام کی جڑ کاٹ دی۔ ایک طرف یہ حضرات یزید کے متعلق یہ کچھ کہتے تھے اور دوسری طرف ان سلاطین کے نام خطبوں میں لئے جاتے تھے، جنہوں نے یزید کی طرح حکومت حاصل کی تھی۔ ان کے نام ہی خطبوں میں نہیں لئے جاتے تھے بلکہ محراب و منبر سے ان کے لئے خلد اللہ ملکہ اور ایدہ اللہ بنصرہٖ کی دعائیں بھی مانگی جاتی تھیں۔ ملوکیت کا تغلب یہ کچھ کراتا ہے۔ اسی جگر پاش حقیقت کا احساس تھا جو اقبالؒ کے لبوں پر اس نالہ و فغاں کی شکل میں آیا کہ ؎

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر　　(ارمغانِ حجاز ص۲۵۹)

شہیرِ امّت کو قفسِ ملوکیت کا خوگر بنانے کے لئے یہ علماء اور حکماء کیا کچھ کیا کرتے ہیں، اس کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے ؎

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند　　تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ　　(ضربِ کلیم ص۱۴۲)

اُس دور میں جن مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں ان کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کتابوں کو ایک نظر دیکھئے جنہیں ہمارے دارالعلوموں میں بطورِ نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ اسی دور میں وہ فقہیں مرتب ہوئیں جو ہزار سال سے

بادشاہوں کے حقوق

تمام مسلمان ممالک میں "شریعتِ اسلامی" کی حیثیت سے مروّج چلی آ رہی ہیں۔ اس فقہ کی رو سے، بادشاہوں کو کس قسم کے حقوق حاصل تھے اس کی دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ فقہ حنفی کی نہایت قابلِ اعتماد کتاب، ہدایہ میں یہ فتویٰ موجود ہے کہ

سربراہِ مملکت قتل کے سوا جو جرم بھی کرے تو اس کی کوئی سزا نہیں۔　　(ہدایہ اوّلین مجیدی ص۴۹۳)

امام ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "محدثین کے ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ بادشاہ وقت سے ظلم و جور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ جرائم کا ارتکاب ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا بھی شرعاً جائز نہیں۔ (احکام القرآن - جلد ۳ صفحہ ۴۳) حتیٰ کہ یافعی نے اپنی تاریخ میں، یزید بن عبدالملک کے زمانے کا واقعہ نقل کیا ہے کہ چالیس شیوخ نے آکر اس امر کی گواہی دی کہ سلاطین قیامت کے دن بغیر حساب کے بخشے جائینگے۔ (تاریخ الیافعی صفحہ ۲۳۴) - اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں شخصی حکومتوں کے سہرے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ ظل اللہ علی الارض (روئے زمین پر خدا کا سایہ) ہوتے ہیں۔

مولویت اور مذہبی پیشوائیت کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ امت کے سامنے قرآن نہ آنے پائے۔ کیونکہ اس کی روشنی میں یہ سازشیں ایک ثانیہ کیلئے بھی ٹھہر نہیں سکتی تھیں۔ لیکن اُمّت کو قرآن کے سامنے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ اس کے اسی جذبہ کی تسکین کے لئے عقیدہ یہ پیدا کر دیا کہ شریعت کے لئے فقہ اور احادیث کافی ہیں۔ اور قرآن صرف تلاوت کے لئے ہے جس سے اجر عظیم ملتا ہے۔

اس طرح امت کو آہستہ آہستہ، صدرِ اوّل کے اسلام کے بجائے اس عجمی اسلام کا اس قدر خوگر بنا دیا گیا کہ وہ اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھنے لگی۔ اگر کوئی حقیقی اسلام کا نام لیتا تو اسے ملحد، بے دین، مرتد قرار دے دیا جاتا۔ اس طرح: ؎

تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!　　　(ضربِ کلیم ص)

شخصی حکومتیں

ضمیر کس حد تک بدل جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آج جبکہ دنیا کی غیر مسلم مملکتیں شخصی حکومتوں کو ختم کر رہی ہیں، یہ اگر شخصی طور پر قائم ہیں تو مسلمانوں کے ممالک میں قائم ہی نہیں، انہیں تقدس حاصل ہے —— پہلی جنگِ عظیم کے بعد، جب مغربی قوتوں نے ترکی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، کمال اتاترک اور ان کی پارٹی نے شخصی حکومت کو ختم کر کے جمہوری نظام رائج کرنے کی کوشش کی تو مسلمانوں کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ اتاترک کے خلاف یہ جرم عائد کیا گیا کہ وہ "خلافت" کو مٹا رہا ہے۔ حالانکہ اس حکومت کو صدرِ اوّل کی خلافت سے کیا نسبت تھی؟ یہ تو شخصی موروثی حکومت تھی۔ لیکن چونکہ اس کا نام "خلافت" رکھ دیا گیا تھا اس لئے اسے قائم رکھنا مذہبی فریضہ قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں "تحریکِ خلافت" کے عنوان سے ملک گیر ایجی ٹیشن اٹھی اور لندن تک وفود بھیجے گئے کہ ترکی کی موروثی شخصی حکومت کو قائم رکھا جائے۔ ہرچند مغربی انداز کی اتاترک کی جمہوریت بھی مطابقِ اسلام نہ تھی لیکن شخصی حکومت سے تو بہرحال بہتر تھی۔ لیکن مسلمان اس تبدیلی کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا..... یوں "غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے۔

بہرحال، یہ تھا وہ مذہب جو اسلام کے نام سے ہمارے ہاں متوارث چلا آ رہا تھا (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) اس سے مفہوم تھا: چند عقائد، اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ارکان اور نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق

مسائل۔ اگر مسلمانوں کو ان کی آزادی حاصل تھی تو انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ کس قسم کی (اپنوں یا غیروں کی) حکومت کے تابع زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس "اسلام" کا امورِ مملکت سے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ انگریزوں نے ہندی مسلمانوں کو اس اسلام کی آزادی دے رکھی تھی تو وہ مطمئن تھے۔ اُن کی حکومت کے خلاف تحریک اٹھی تو وہ سیاسی آزادی کے لئے تھی۔ اسلام کا اس سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ ہندو ..... اطمینان دلا رہا تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد، مسلمانوں کو اسلام کی ویسی ہی آزادی حاصل ہوگی جیسی انگریز کے عہدِ حکومت میں تھی۔ وہاں کے علماء کرام اس سے خوش تھے اور تحریکِ آزادی میں ہندوؤں (کانگریس) کے ساتھ تھے۔

(۶)

اقبالؒ کا احسان

اقبالؒ کا ملتِ اسلامیہ پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اس حقیقت کو بہ تکرار و اصرار واضح کیا کہ جو اسلام ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے، اور جس کی علمبردار ہماری مذہبی پیشوائیت ہے۔ وہ، وہ اسلام نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا، اور جو ہمارے صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا۔ مروجہ اسلام وہ ہے جو ہمارے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور جسے مذہبی پیشوائیت متواتر آگے بڑھائے چلی آ رہی ہے۔ صدرِ اوّل کا اسلام، اس مملکت میں قائم ہو سکتا ہے جس میں قرآن، اور صرف قرآن کی حکمرانی ہو۔ اس کے نہایت مختصر، لیکن بیحد جچے تلے الفاظ میں:۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(اگر تو مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے قرآن کے سوا کوئی طریق نہیں)۔

اس نے کہا کہ ہمارا مروجہ اسلام، عربی ملوکیت کا وضع کردہ مذہب ہے، اور جب ملوکیت ہی اسلام کی ضد ہے تو اس کا وضع کردہ مذہب کس طرح اسلامی قرار پا سکتا ہے؟ زہریلے دودھ کی دہی اور بالائی بھی زہریلی ہوگی۔ لہٰذا حقیقی اسلام کے احیاء اور قیام کے لئے ضروری ہے کہ مروجہ ملوکیتی اسلام کو ختم کر دیا جائے۔

تصورِ پاکستان

اقبالؒ نے اس تصوّر کو محض نظریہ کے طور پر پیش نہیں کیا۔ اس نے اس کی عملی تشکیل کا راستہ بھی متعیّن کر دیا۔ اس نے (۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں) کہا کہ اس کے لئے قدم اوّل مسلمانوں کی ایسی آزاد مملکت کا قیام ہے جس میں ملوکیتی اسلام کی جگہ قرآنی اسلام نافذ کیا جا سکے۔ انہوں نے کہا تھا کہ

> اس مملکت کے قیام سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی صحیح

معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

اس سے بھی پہلے، انہوں نے (اپنے خطبات تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں) سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہم نوائی میں کہا تھا کہ

> ہمارے لئے رشد کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی رنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ جس جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ الگ کر دیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو ازسرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

اسی خطبہ میں انہوں نے، قانون سازی کے سلسلہ میں کہا تھا کہ اس جمود کا بنیادی سبب وہ فقہی قوانین ہیں جو ہمارے دورِ ملوکیت میں، ہزار سال پہلے مدوّن ہوئے تھے، اور جنہیں ابدی اور ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دے دیا گیا ہے۔ ان قوانین کی جگہ، قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اُمت کے مشورہ سے ایسے قوانین مرتب کئے جائیں گے جو عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس دشوار گذار مرحلہ کو وہی بطلِ جلیل طے کر سکے گا جو عمر رضی (فاروق) کی سی جرأت ایمانی کے ساتھ، یہ کہتا ہوا اس فریضہ کو اپنے ذمے لے کہ

حسبنا کتاب اللہ

تمہارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

وہ جانتے تھے کہ اس تحریک کی سب سے زیادہ شدید مخالفت، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی۔ کیونکہ اس سے نہ صرف ان کا اقتدار چھن جائے گا بلکہ اس انسٹی ٹیوشن کا وجود تک باقی نہیں رہے گا۔ اسی لئے انہوں نے قوم کو وارن کیا تھا کہ ان کے تسلّط سے پیچھا چھڑانا ازبس ضروری ہے۔

مولوی حضرات کا چنگل

انہوں نے اکبر شاہ خان صاحب (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا:۔

> آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خان کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا لیکن خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار، ہندی مسلمانوں میں مکرر سے قائم کر دیا۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا...... (اس پر) بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔ (انوارِ اقبالؒ۔ صـ۱۷۳ـ)

اس کے بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس (منعقدہ مارچ ۱۹۳۲ء) میں اپنے خطبۂ صدارت

کے دوران فرمایا:۔

> تمہارے دین کی یہ بلند فطری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے۔ اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات اور جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جسے صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا ہے۔ ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں، اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

ان حضرات کی طرف سے کفر کے فتوے تو ان کے ترکش کے اوّلین تیر ہوتے ہیں، لیکن اُس زمانے میں ان سے بھی زیادہ مؤثر اور کارگر ایک اور حربہ تھا۔ لوگوں کے دلوں میں انگریز کے خلاف نفرت اس قدر شدید تھی کہ اگر کسی کے متعلق کہہ دیا جاتا کہ وہ "انگریز نواز" ہے تو عوام ——"ٹوڈی بچہ، ہائے ہائے" کے نعروں سے اس کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ چنانچہ ان حضرات نے سب سے پہلے یہی حربہ استعمال کیا۔ اور اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ دونوں کے متعلق مشہور کر دیا کہ یہ انگریز کے پٹھو ہیں۔ اور ان کی تحریکِ پاکستان، "درحقیقت انگریز کی تخلیق ہے۔ (مولانا) حسین احمدؒ (مدنی)۔ دار العلوم دیو بند کے شیخ الحدیث، اور اس زمانے کی جمعیت العلماءِ ہند کے صدر —— اس باب میں پیش پیش تھے۔ وہ کہتے تھے کہ

مخالفت

> جو لوگ مسلمانوں کو اس میدانِ سیاست (یعنی کانگریسی میدانِ سیاست) میں آنے سے روک رہے ہیں اور متحدہ قومیت کی بھیانک صورت ظاہر کر کے نفرت دلا رہے ہیں، بلاشک وشبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات انجام دے رہے ہیں جو اس کی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پا سکتیں۔ (پمفلٹ: متحدہ قومیت اور اسلام۔ صلے)

انہوں نے علامہ اقبالؒ کا نام لے کر کہا:۔

> غرضیکہ جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگذاریوں سے سر سید جیسے تجربہ کار، عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالٹیکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا اور اس کے ذریعے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاست سے الگ رکھوا کر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنا دیا۔ پھر اگر ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے۔ (ایضاً۔ صہے)

اس کے بعد ان کی طرف سے، حسبِ عادت کفر کے فتوؤں کی یلغار شروع ہو گئی۔ اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیا گیا۔

ہندی اسلام

سوال یہ ہے کہ اس مخالفت کے حق میں یہ حضرات دلیل کیا دیتے تھے؟ وہی جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ جب ہندوستان کی آزاد

مملکت میں، مسلمانوں کو مذہب کی آزادی حاصل ہوگی تو پھر اس مقصد کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا مطالبہ یکسر غیر اسلامی اور سازش ہے۔ (مولانا) حسین احمد (مدنی۔ مرحوم) ارشاد فرماتے تھے:۔

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے، سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔ (زمزم۔ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

مذہبی آزادی کے متعلق وہ فرماتے تھے:۔

کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔

(مولانا مدنی کا پمفلٹ۔ متحدہ قومیت اور اسلام۔ ص۶۱)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے) یہ جنگ درحقیقت اسلام کے دو تصورات کے درمیان تھی جو ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ایک تصور اقبالؒ کا پیش کردہ تھا جو صدرِ اوّل کا قرآنی اسلام (الدین) تھا۔ اس کے برعکس، دوسرا تصور اس عجمی اسلام کا تھا جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور جس کی علمبردار ہماری مذہبی پیشوائیت تھی۔ علامہ اقبالؒ کی وفات سے چند ماہ پیشتر (جنوری ۱۹۳۸ء میں) ان کے اور مولانا مدنی (مرحوم) کے درمیان ایک معرکہ آراء تحریری مباحثہ ہوا تھا جسے حضرت علامہؒ نے "معرکۂ دین و وطن" کے عنوان سے تعبیر کیا تھا۔ اس میں ان ہر دو تصورات کے تضاد پر بڑی اہم گفتگو ہوئی تھی۔ علامہ کا وہ بیان درحقیقت، مملکتِ پاکستان کا منشور تھا۔

(۰)

قائدِ اعظمؒ

علامہ اقبالؒ کے بعد، قائدِ اعظمؒ اس میدان میں شرکت فرما ہوئے تو دین کا حقیقی تصور اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آ گیا۔ اقبالؒ کی طرح انہوں نے بھی اس کے ــــ منفی اور مثبت ــــ دونوں گوشے اجاگر کئے۔ منفی حیثیت سے انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اس مملکت میں مذہبی پیشوائیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ انہوں نے ۵ فروری ۱۹۴۸ء کو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، نوجوان طالب علموں سے کہا کہ

مسلم لیگ نے کم از کم ایک کام تو کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں، وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس نے بلاشک و شبہ تمہیں اس ناخوش آئندہ، غیر مطلوب عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ (تقاریر قائدِ اعظمؒ۔ حصہ اوّل ص۴۸)

اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے مختلف مواقع پر اس کا اعلان کیا کہ اس مملکت میں تھیاکریسی

نہیں ہوگی۔ انہوں نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔

(تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۸۶)

انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی اس حقیقت کو علی الاعلان واضح کیا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا تھا کہ

پاکستان کی مجلسِ قانون ساز نے ابھی پاکستان کا دستور مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی آخری شکل کیا ہوگی۔۔۔۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۶۵)

چونکہ ہمیں ہنوز (پورے طور پر) تھیاکریسی سے واسطہ نہیں پڑا اس لئے اسے نہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اندازِ حکومت کس قسم کا ہوتا ہے، نہ ہی اس کا (کماحقہ) احساس کر سکتے ہیں کہ یہ کس قدر انسانیت سوز ہوتا ہے۔ اس میں فیصلے مذہبی پیشوا ہی کے ہوتے ہیں لیکن ان کا نفاذ حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔

تھیاکریسی کیا ہوتی ہے

(مثلاً) اگر انہوں نے کہہ دیا کہ کل عید نہیں ہوگی تو حکومت کا محکمۂ فلکیات لاکھ اس کی تردید کرے، حکومت انہی کے فیصلہ کو نافذ کرنے پر مجبور ہوگی۔ دوسری طرف حکومت بھی ان سے اپنے بڑے بڑے کام لیتی ہے۔ (مثلاً) اس نے کوئی ایسا قدم اٹھانا ہو جس کے متعلق عوام کی مخالفت کا ڈر ہو، تو وہ مذہبی پیشوائیت سے اس کے، مطابقِ شریعت ہونے کا فتویٰ حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے بعد کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اس کی مخالفت کرے۔ حتیٰ کہ اگر حکومت کو اپنے کسی مخالف کو راستے سے ہٹانا ہو تو مذہبی پیشوائیت اس کے مرتد ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے۔ اس کے بعد حکومت مزاحیت، اطمینان سے اس کا سر اڑا سکتی ہے۔ کوئی اس کے خلاف لب کشائی تک نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی مخالفت سے اس کے خود اپنے مرتد قرار دئے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ یہ ہوتی ہے مختصر الفاظ میں تھیاکریسی ——— یعنی مذہبی پیشوائیت کی حکومت ——— نوعِ انسان کی تاریخ میں، ان ادوار سے بدتر کوئی دور نہیں ملے گا جن میں کسی بدنصیب ملک میں تھیاکریٹک نظامِ حکومت نافذ رہا ہو۔ یہ تھا مذہبی پیشوائیت کے تصور کا وہ اسلام، جسے ختم کرنے کے لئے حصولِ پاکستان کے لئے جدوجہد کی جا رہی تھی اور جس کی سخت مخالفت وہاں کے علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔

اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے تصور کے اسلام کا یہ منفیانہ پہلو تھا۔ جہاں تک اس کے مثبت پہلو کا تعلق ہے

قائدِ اعظمؒ نے اسے اس طرح متعین اور واضح کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے متعلق عام تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ (بقول ان معترضین کے) "سوٹڈ۔ بوٹڈ۔ انگلینڈ ریٹرنڈ۔ صاحب بہادر تھا۔۔۔ اسے اسلام اور اس کے حقائق سے کیا واسطہ؛ اس مقام پر میں، اپنا نام درمیان میں لانے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ قائدِ اعظمؒ کے متعلق میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ میری شنید نہیں، دید ہے۔ مجھے ان سے قریب دس سال تک ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ میرے اور ان کے درمیان وجہِ اشتراک، قرآنِ کریم تھا۔ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر شہادت دے سکتا ہوں کہ قرآنی حقائق اور دین کے اصول و اقدار، ان کے قلب کی گہرائیوں میں اترے ہوئے تھے، اور چونکہ وہ بے حد ذہین اور ذکی قانون دان تھے اس لئے انہیں فکری طور پر بھی اس کا خاص شعور و ادراک حاصل تھا کہ اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں، میں ان کے متعدد ارشادات پیش کر سکتا ہوں، لیکن ان کا ایک تجزیہ اس قدر جامع اور منفرد ہے کہ اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور یہ تجزیہ وہ ہے جو انہوں نے ۱۹۴۱ء میں

اسلامی مملکت کا تصوّر

حیدر آباد (دکن) کی عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا کے ایک سوال کے جواب میں برجستہ ارشاد فرمایا تھا۔ طلباء نے پوچھا یہ تھا کہ جسے آپ اسلامی مملکت کہتے ہیں، اور جس کے حصول کے لئے آپ مصروفِ جدّوجہد ہیں، اس کی امتیازی خصوصیت کیا ہے۔ یعنی اسلامی مملکت، دیگر انواعِ مملکت سے کس طرح منفرد اور مختص ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ

> اسلامی مملکت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ، قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

اس تجزیہ کی جامعیت کے متعلق کہنے کو تو کیا کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن میں صرف دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ۔۔۔۔ کہ ہمارے ہاں کے متقدمین اور آج تک کے متاخرین نے اسلامی مملکت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس، میں کسی جگہ کوئی تحریر بھی ایسی نہیں ملے گی جس میں اسلامی مملکت کا امتیازی اور منفرد تصوّر اس اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ یہ تھا (بقول معترضین) "اسلام سے بے بہرہ، سوٹڈ بوٹڈ۔ صاحب بہادر" محمد علی جناحؒ! اقبالؒ نے جو کچھ اپنے متعلق کہا تھا وہی کچھ قائدِ اعظمؒ کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔۔۔ کہ گرچہ سر نتراشند، قلندری داند۔

دوسری بات یہ کہ اس پینتیس سال کے عرصہ میں، پاکستان میں (اور بیرونِ پاکستان) قائدِ اعظمؒ

کے متعلق سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ ہزاروں آرٹیکل شائع ہوئے۔ لاتعداد کانفرنسیں، سمینار، مذاکرات منعقد ہوئے۔ ان کی سالگرہیں اور برسیاں منائی گئیں۔ کیا آپ نے ان میں کسی جگہ قائداعظمؒ کے انٹرویو کے اس اقتباس کو لکھا یا کسی مقرر کی زبان سے سنا ہے؟ آپ سوچئے کہ یہ خبری گہری سوچ کا مقام ہے۔ ایسا سہواً نہیں ہوا، دانستہ کیا گیا ہے۔ یہ دلخراش حقیقت ایک گہری سازش کی غمازی کرتی ہے۔ وہ سازش جس کا ذکر ابھی آپ کے سامنے آئے گا۔

(۰)

پاکستان وجود میں آگیا اور بظاہر ایسا دکھائی دیا کہ اسلام کے اس تصوّر کو فتح حاصل ہوگئی ہے جسے اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ نے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کے طور پر پیش کیا تھا۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا تقسیم ہند سے یہاں ایک خطۂ زمین حاصل ہوا تھا جس میں ایسی مملکت قائم کرنا مقصود تھا جس میں، اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ کے تصوّر کے اسلام (یعنی صدرِ اوّل کے قرآنی اسلام) کو عملاً نافذ کیا جا سکتا......

اس اسلام کو فتح اس وقت نصیب ہوتی تھی جب وہ یہاں عملاً نافذ ہو جاتا جس مذہبی پیشوائیت کے تصورِ اسلام کو در نظر بظاہر شکست ہوئی تھی اسے اس کا علم تھا کہ شکست و فتح کا آخری فیصلہ ہونا ہنوز باقی ہے۔ اقبالؒ تشکیلِ پاکستان سے پہلے ہی ہم سے رخصت ہو چکا تھا۔ قائدِاعظمؒ محض زندگی کے سانس پورے کرنے کے لئے ہم میں رہے۔ ان شکست خوردہ نبردآزماؤں نے دیکھا کہ میدان خالی ہے تو وہ یلغار کر کے یہاں آگئے اور آتے ہی یہ نعرہ بلند کیا کہ

پاکستان، اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے
یہاں اسلام نافذ ہوگا۔

یہاں کوئی نہیں تھا جو ان سے پوچھتا کہ آپ یہاں کونسا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسلام سے بہر نوع ان کی مراد وہی اسلام تھا جسے مٹانے کے لئے مملکتِ پاکستان وجود میں آئی تھی۔

مذہبی پیشوائیّت کی یلغار

اس یلغار کی روک تھام، اقبالؒ اور جناحؒ کے قدو قامت کا کوئی لیڈر ہی کر سکتا تھا۔ ایسا لیڈر یہاں کوئی نہیں تھا۔ جو لیڈر، اقبالؒ اور جناحؒ کی جانشینی کے مدعی تھے، ان میں اکثریت ان کی تھی جو ان ہر دو اسلاموں کے فرق کو جانتے نہیں تھے۔ جو دو چار اسے جانتے تھے انہوں نے دبے دبے سروں میں اس کے خلاف آواز اٹھائی تو ان کے خلاف اس قدر شدید پراپیگنڈہ کیا گیا کہ نہ انہوں نے اس باب میں دوبارہ لب کشائی کی، نہ اوروں نے اس کی جرأت۔ یہ حضرات قدمِ اوّل ہی میں تھیاکریسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت رفتہ رفتہ اس تک پہنچے۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ مطالبہ پیش کیا کہ مملکت کے قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ حالانکہ اس مطالبہ کے پیش کرنے والے اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ ہر فرقہ کی سنّت الگ الگ ہے اس لئے سنّت کی بنا پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم

کرلیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ اپنے اس ناقابلِ عمل مطالبہ پر زور دیتے جاتے تھے کہ مملکت کا ضابطہ قوانین کتاب وسنت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس مطالبہ کے بہ تسلسل پیش کئے جانے سے مقصد یہ تھا کہ عوام میں مشہور کیا جائے کہ اربابِ اقتدار یہاں اسلام نافذ نہیں کرنا چاہتے۔

صدر ایوب مرحوم

اگر اسلام نافذ ہوگا تو مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں ہی ہوگا۔ صدر ایوب نے ایک دفعہ "غلطی سے" یہ کہہ دیا کہ

> اپوزیشن کے رہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر مسلمانوں میں موجودہ فرقے موجود نہ ہوتے، جس طرح خدا اور رسولؐ کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ میں نے علماء سے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں، اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں، کہ یہ لوگ قانون کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کریں۔ اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پہ دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں۔ (نوائے وقت۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء)

اگر یہ حضرات اپنے مطالبہ میں ذرا بھی دیانتدار ہوتے تو انہیں صدرِ مملکت کی اس پیش کش پر فوراً لبیک کہنا چاہیئے تھا۔ لیکن اس سے ان کی سازش کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ لہٰذا، اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "یہ شخص بدنیت ہے اور علماء کے اختلاف کو خواہ مخواہ سپر بنا رہا ہے۔" (نوائے وقت ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء)۔

بیس برس تک ان لوگوں نے یہ پروپیگنڈہ جاری رکھا اور اس کے بعد ایک اور قدم آگے بڑھایا۔ اس مطالبہ کے پیش کرنے والوں میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) سرفہرست تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ

> کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاء کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ایشیا۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ ان اکتیس علماء میں سے، جنہوں نے بیس سال پہلے کتاب و سنت کے مطابق قوانین مرتب کرنے کا مطالبہ پیش کیا تھا، کسی ایک نے

ناممکن العمل

نہ تو مودودی صاحب کے اس اعلان کی تردید کی اور نہ ہی ان سے یہ تک پوچھا کہ جب یہ مطالبہ ناممکن العمل تھا تو اسے پیش کیوں کیا گیا تھا؟ اس سے واضح ہے کہ ان سب کو معلوم تھا کہ یہ مطالبہ ناممکن العمل ہے۔ اور حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کا حربہ..... اس کے بعد جب مرحوم سے پوچھا گیا کہ جب کتاب وسنت کی رو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، تو پھر قانون سازی کی صورت کیا ہوگی۔ فرمایا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔

حالانکہ وہ خود فقہ کے سخت مخالف تھے۔ اس کے متعلق ان کے نظریات یہ تھے:۔

(۱) مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا۔ اس کے اجتہادات کا تمام زمانوں میں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ پانچواں ایڈیشن۔ صفحہ ۴۲۶)

(۲) بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو اٹل قانون قرار دیئے جا سکتے ہیں اور نہ سب سے سب دریا بُرد کر دینے کے لائق ہیں۔ صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں ردّوبدل کیا جا سکتا ہے۔

مودودی اور فقہ حنفی

(رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ ایڈیشن ستمبر ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۲۸۲)

(۳) یہ سلف کونسے انبیاؑ تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۱۳۷)

(۴) بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

(۵) میں نہ مسلکِ اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۳۵)

(۶) میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ۔ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۴۴)

(۷) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔

(تنقیحات۔ پانچواں ایڈیشن۔ صفحہ ۱۲۰)

یہ تھی وہ فقہ جسے مملکتِ پاکستان کا ضابطہ قوانین بنانے کی تجویز مودودی مرحوم نے کی تھی۔ بات واضح ہے۔ جس طرح، وہ یہ جانتے ہوئے کہ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، کتاب و سنت کو ضابطہ قوانین بنانے پر بیس سال زور دیتے رہے، اسی طرح انہوں نے یہ جانتے ہوئے کہ فقہ ایک "منجمد شاستر" ہے، اسے بطور ضابطہ قوانین بنانے کی تجویز کر دی۔ اس فقہ کے عملاً نافذ ہونے پر ملک کی جو حالت ہونی تھی، وہ تو ایک طرف رہی، جو فرقے فقہ کو اسلامی شریعت تسلیم نہیں کرتے تھے انہوں نے اُسی زمانے میں اس کی مخالفت شروع کر دی جس سے ملک میں تشتت و انتشار پھیل گیا۔ اس پر مودودی مرحوم سے پوچھا گیا کہ اس مسلسل اضطراب اور انتشار کا آخر حل کیا ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ

تھیا کریسی

میں واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے، اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو، جو اسلام کو جانتے بھی ہیں۔ دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائینگے۔

(ایشیا - ۹ رمئی ۱۹۷۶ء)

یہ تھیا کریسی کے عملی قیام کی تجویز تھی۔ اس وقت بھٹو حکومت کا آخری دور تھا۔ وہ سلسلہ ... نہ رہتا تو معلوم اس کے بعد کیا (DEVELOPMENT) ہوتی لیکن ۱۹۷۷ء کی عسکری حکومت نے اس دور کا خاتمہ کر دیا۔ جنرل ضیاءؔ نے برسرِ اقتدار آتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ ان کا مقصد ملک میں اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کا نفاذ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پیشِ نظر علماء حضرات والا اسلام ہی ہو سکتا تھا۔ ہم کسی کی نیت پر شبہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہو سکتا ہے کہ جنرل موصوف نیک نیتی سے اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتے ہوں۔ لیکن اگر وہ نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں تو، اور (اگر بفرضِ محال) ... وہ اسے مذہبی پیشوائیت کی مخالفت کی روک تھام کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو نتیجہ بہر صورت یکساں ہے۔ کسی کو سنکھیا نیک نیتی سے کھلا دیجئے یا بدنیتی سے اسے مارنے کے لئے، دونوں صورتوں میں نتیجہ اس کی ہلاکت ہوگا۔ اتنا تو بہرحال واضح ہے کہ جنرل موصوف خود بھی اسے ناممکن العمل تسلیم کرتے ہیں۔ اس اسلام کی پہلی قسط، حدود (سزاؤں سے متعلق قانون) کا نفاذ تھی۔ ان کے متعلق وہ متعدد بار اعلان کر چکے ہیں کہ ان پر عمل درآمد ناممکنات میں سے ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ یہ قوانین، ہزار سال پہلے کے دورِ ملوکیت کے وضع کردہ ہیں۔ یہ نہ، قرآن کے مطابق ہیں۔ نہ دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق۔ انہیں ناقابلِ تغیر و تبدل سمجھنا بنیادی غلطی ہے۔

اسلام کا یہ تصور کس طرح حقیقی اسلام کے خلاف ہے، ہم سرِ دست اس بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتے، لیکن کم از کم اتنا تو واضح ہے کہ اسلام کا جو تصور اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے پیش کیا تھا اور جسے نافذ کرنے کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کو حاصل کیا تھا، جو اسلام، یہاں نافذ کیا جا رہا ہے، یہ وہ اسلام تو نہیں۔ یہ حقیقت بڑی تعجب انگیز ہے کہ یہ حضرات اٹھتے بیٹھتے یہ کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں اقبالؒ کے افکار سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیئے اور قائدِ اعظمؒ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے اور نافذ اس اسلام کو کر رہے ہیں جسے ختم کرنے کے لئے اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے مملکتِ پاکستان کی تشکیل کی تھی!

(٥)

فقہی اسلام کی چند مثالیں

جس قسم کا اسلام یہاں نافذ کیا جا رہا ہے اس سے معاشرہ کا نقشہ کس قسم کا ہوگا، اس کی تفاصیل تو طویل ہیں جن کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہم صرف دو چار نقاط پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان کے لئے حوالے مودودی مرحوم کے دیئے جائیں گے کیونکہ یہاں کی "شریعت" انہی کے نظریات کے گرد گردش کر رہی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ کہ اس میں جھوٹ بولنا شرعاً عام ہو جائے گا۔ عام ہی نہیں بلکہ واجب۔ مودودی مرحوم کا ارشاد ہے:۔

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور

جھوٹ جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب (واجب ہونے) تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء۔ صـ۵۳)

علماء حضرات میں سے اس کی تردید یا مخالفت کسی نے نہیں کی۔

(۲) عصرِ حاضر میں جنسیات نے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس باب میں ان کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

(تفسیر تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ صـ۵۷۔ نیز ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء)

جنسیات نابالغ لڑکیوں سے خلوت (یعنی جنسی اختلاط!!)۔

(۳) ان سے دریافت کیا گیا کہ جنت کی حوریں کون ہوں گی۔ جواب دیا:۔ کفار کی لڑکیاں جو کمسنی میں وفات پا گئی ہوں گی، انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائے گا۔ (ایشیا۔ ۱۴ جون ۱۹۶۹ء)۔ اہلِ جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں (محلات) میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔ (تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ صـ۲۷)

کفار کی کم سن لڑکیاں مومنین کے تصرف میں!

(۴) مشت زنی کے متعلق انہوں نے فرمایا:۔

صحیح مسلک تو یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت، زنا اور عملِ قومِ لوط اور وطیٔ بہائم کی بہ نسبت کم تر ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اس ذریعہ سے کر لے تو اس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے۔ (رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ صـ۲۰۲)

خدا ایسے حالات میں ضبطِ نفس کا حکم دیتا ہے۔

(۵) متعہ کے متعلق ارشاد ہے:۔

فرض کیجئے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد اور عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرہ میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے

مجبور ہیں۔ اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہمی خود ہی ایجاب و قبول کر کے اس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کر لیں جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی ان تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ متعہ اسی طرح کی اضطراری حالت کے لئے ہے۔
(ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۵۵ء)

اسی قسم کے نظریات پر مبنی قوانین مرتب ہو جائیں گے۔

۶۔ لونڈیاں

لونڈیوں کے متعلق ہماری فقہ کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے احکام آئے ہیں۔ مودودی مرحوم نے بھی اس سلسلہ میں خاصی طویل بحث کی ہے۔ جاہلیت عرب میں جنگ میں گرفتار شدہ مردوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے ان غلاموں اور لونڈیوں کو جو نزول قرآن کے زمانے میں عربی معاشرہ میں موجود تھے، آہستہ آہستہ معاشرہ کا جزو بنا لینے کے احکامات صادر فرمائے اور آئندہ کے لئے یہ دروازہ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ ان قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر رہا کر دینا ہوگا اور یا احسان رکھ کر (...)۔ لیکن ہمارے دورِ ملوکیت نے اس بند دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔ اور غلام اور لونڈیاں ان کے ہاں عام ہو گئیں۔ فقہ نے یہ اجازت عام کر دی۔ دنیا غلامی کی لعنت کو ختم کر رہی ہے لیکن ہمارے اربابِ شریعت اسے عین مطابق اسلام قرار دے رہے ہیں۔ مودودی مرحوم نے اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم۔ اور اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں بڑی وضاحت سے ان احکام کو درج فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کر دے چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھوں میں ہوں۔ اور چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۳۴۰)

وہ تفہیمات (جلد دوم) میں لکھتے ہیں۔

> ان عورتوں کے لئے اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دے دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے۔ (صفحہ ۳۴۳)

اس جنسی تمتع کے لئے نکاح کی بھی ضرورت نہیں۔ (صفحہ)۔ اور تعداد کی بھی کوئی قید نہیں (صفحہ ۳۴۴) انہیں فروخت بھی کیا جا سکتا ہے۔ (صفحہ ۳۴۴)[1]

یہ ہے وہ اسلام جو ہمارے عہدِ حکومت میں وضع ہوا تھا اور جس کے احیاء کی اب کوشش کی جا رہی ہے۔ اور یہ ہے اس اسلام میں عورت کی حیثیت۔ لونڈیاں عورتیں ہی ہوتی ہیں۔

(٠)

---

[1] ان امور کی تفصیل ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ (قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں) میں دیکھئے۔

معاشیات

ہمارا دور، عہد اقتصادیات (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے جس میں سرفہرست اہمیت معاشی نظام کو حاصل ہے۔ ہمارے دور پر ملوکیت کا اسلام سرمایہ داری کا نظام تھا اور فقہ کے احکام اسی نظام کی تشریحات پر مبنی ہیں۔ دنیا اب اس نظام کے ہاتھوں تنگ آچکی ہے لیکن مغرب کی سرمایہ دارانہ مملکتیں اسے کسی نہ کسی طرح برقرار رکھنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس کے لئے انہیں مسلمانوں کی مملکتوں کی تائید کی ضرورت ہے اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہمارے عہد ملوکیت کے اسلام کو حقیقی اسلام قرار دے کر اسے پھر زندہ کر دیا جائے۔ (اس اسلام میں اقتصادی نظام کس قسم کا تھا اور کس قسم کا ہوگا) اس کی بحث مودودی مرحوم نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں کی ہے۔ اس کے دو ایک اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ پھر آخر تنہا زرعی جائداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے مقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے بے کار کر دیا جائے (مسئلہ ملکیت زمین۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء، ص ۵۲-۵۳)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

> آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو، جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو اور جسطرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کس ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شراکت پر

کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون ساریاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں، وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ (ایضاً ص ۷۲-۷۳)

یہ نظام سرمایہ داری کی ایسی شدید شکل ہے جسے اب سرمایہ دار مملکتیں بھی آہستہ آہستہ ترک کر رہی ہیں۔ اس کی ابتدا ابھی سے ہمارے ہاں ہو گئی ہے۔ بیحد و نہایت دولت جمع کرنا عین مطابق شریعت۔ مزارعت (بٹائی یا کرایہ پر زمین کاشت کرانا) جائز۔ مضاربت (یعنی سرمایہ پر نفع حاصل کرنا) حلال۔ بینکوں میں روپیہ جمع کرا کر منافع حاصل کرنا جائز۔ یعنی حکومت کی مقرر کردہ زکوٰۃ ادا کرتے رہو تو سب کچھ جائز۔ یعنی جس معاشی نظام کو قرآن، خدا اور رسولؐ کے خلاف بغاوت قرار دیتا ہے اسے عین مطابق اسلام قرار دے کر نافذ کیا جا رہا ہے۔

(۰)

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا اسلام جو قرآن کے بھی خلاف ہے اور علم و عقل کے بھی منافی، وہ ہمارے دور ملوکیت میں قائم کیسے رہ سکتا تھا؟ اسے قائم رکھنے کے لئے ان حضرات کے پاس ایک بڑا مؤثر حربہ ہے۔ اور وہ ہے ارتداد کا فتویٰ۔ یعنی جو شخص اس اسلام کی کسی شق سے بھی انکار کرے، اس کے متعلق فتویٰ صادر کر دیا جائے کہ وہ مرتد ہو گیا ہے۔ اور مرتد کی سزا موت ہے۔

مرتد کی سزا موت

واضح رہے کہ مرتد سے مراد وہی شخص نہیں جو اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ مرتد وہ بھی ہے جو ان حضرات کے عقائد سے اختلاف کرے۔ اس کی سزا بھی موت ہے۔ یہ کوئی نظری مسئلہ نہیں۔ ہماری تاریخ کے صفحات ان بیگناہوں کے خون سے رنگین ہیں جنہیں زعماء کے فتووں کی رو سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ اس کی شہادت بغداد کی گلیاں دیں گی جن کی نالیوں میں یہ خون پانی کی طرح بہتا رہا تھا۔ یہ مسئلہ مذہبی پیشواؤں کے علاوہ، خود حکومت کے لئے بھی بڑا مفید مطلب تھا۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) جس سیاسی حریف کو راستے سے ہٹانا مقصود ہوتا، اس کے خلاف ارتداد کا فتویٰ لگوا دیا جاتا۔ پھر اس کے قتل کے خلاف کوئی شخص لب کشائی نہ کر سکتا کیونکہ ایسا کرنے والے کو بھی مرتد قرار دے دیا جاتا۔

پاکستان میں جب مذہبی پیشوائیت نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں تو اس کے ساتھ ہی اس "مسئلہ" کی اہمیت بھی نمایاں کی گئی کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ مودودی مرحوم نے ۱۹۵۱ء میں اپنا وہ کتابچہ شائع کیا جس کا عنوان ہے "مرتد کی سزا، اسلامی قانون میں"۔ حضرات علماء کرام میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہ کی، کیونکہ (بقول مودودی مرحوم)

یہ تمام فقہائے اسلام کا متفق علیہ فیصلہ ہے اور اس باب میں ماہرین علم شریعت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے (پمفلٹ مذکور ص ۷)

اس کی مخالفت بھی طلوع اسلام ہی کے مقدر میں لکھی تھی۔ چنانچہ اس نے متعدد مقالات میں اس پر تفصیلی بحث کی جسے بعد میں اس کتابچہ میں محفوظ کر دیا گیا جس کا عنوان ہے "قتل مرتد اور غلام اور لونڈیاں"۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ دور ملوکیت کے اسلام کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا گیا ہے اس میں حوالے مودودی مرحوم کی کتابوں کے دیئے گئے ہیں لیکن یہ مرحوم کے اپنے خیالات نہیں۔ یہ سب اس فقہ اور روایات پر مبنی ہیں جن پر مذہبی پیشوائیت کا اتفاق ہے۔ اسی اسلام کو یہ حضرات یہاں رفتہ رفتہ رائج کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

(۰)

میں آخر میں عرض کر دوں کہ (جیسا کہ میں نے اکثر کہا ہے) میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ اس سے زیادہ میرا کوئی دعویٰ نہیں۔ میرا نہ کوئی فرقہ ہے، نہ پارٹی۔ نہ میرے پاس کوئی وسیع ذرائع یا وسائل ہیں۔ بلکہ ملک کے عام ذرائع ابلاغ جن کے دروازے ہر کس و ناکس پر کھلے ہیں، مجھ پر وہ بھی بند ہیں۔ مجھے اس کا نہ کوئی گلہ ہے نہ شکایت۔ قرآن کریم کی رو سے مجھ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جو کچھ میں قرآن سے سمجھوں اسے دوسروں تک بھی پہنچاؤں۔ میں اسی ملت کا ایک فرد ہوں۔ اس جہت سے میرے سینے میں ملت کا درد ہے۔ خطۂ پاکستان کے ساتھ میری (بزدیک کی نہیں تو دُور کی) امیدیں وابستہ ہیں اس لئے اس کا استحکام میرا جزو زندگی ہے۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر میں جب کسی خطرہ کا احساس کرتا ہوں تو ملت کو اس سے آگاہ کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ بنابریں میں ملک کے ارباب دانش۔ اعیانِ سیاست حتیٰ کہ ارباب اقتدار کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تھیا کریسی ابتداءً بڑی معصوم (INNOCENT) سی نظر آیا کرتی ہے لیکن جب یہ عوام پر اپنا تسلط جما لیتی ہے تو پھر اس سے پیچھا چھڑانا تو ایک طرف، اس کے سیلاب کی روک تھام بھی (اور تو اور) حکومت کے بھی بس کی بات نہیں ہوتی۔ تاریخ میں دیکھئے۔ کتنے تاج اس کے ہاتھوں اُڑتے اور کتنے تخت اس کے دھکوں سے الٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے متعلق مودودی مرحوم نے دو ٹوک بات کہدی تھی۔ ان سے پوچھا گیا کہ اسلامی نظام قائم ہو جانے پر موجودہ "پیدائشی مسلمانوں" کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ:

قتل عام

جس علاقے میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے گی کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے۔ اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔ (مرتد کی سزا۔ ۱۹۵۱ء ایڈیشن بحث)

"اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں"! یعنی جو ان کے ہمنوا ہوں! یہ ہوگا اسلامی نظام کی تکمیل کا دن!!

بعض خواب کس قدر حسین، لیکن ان کی تعبیر کیسی بھیانک ہوتی ہے۔ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ نے بویا کیا تھا اور اُگ کیا آیا؟ اقبالؒ زندہ ہوتا تو وہ یقیناً یہی کہتا کہ:

تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو!
کانچہ کشتیم زخجلت نتواں کرد درو

(بانگِ درا۔ صـ ۲۴۳)

والسلام

—(۰)—

قرآنک کالج

میں نے طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مئی جون ۱۹۸۲ء میں ان وجوہات کا ذکر کیا تھا جن کی بنا پر قرآنک کالج کا قیام ابھی تک عمل میں نہیں آ سکا۔ ان میں سرفہرست حکومت کی طرف سے عائد کردہ وہ پابندی تھی جو کالجوں کے کھولنے پر لگی ہوئی ہے۔ ہم نے جب ۱۹۷۹ء میں مجوزہ کالج کے لئے عطیات کی اپیل کی تھی تو اس کی پوری پوری توقع تھی کہ یہ پابندی اُٹھ جائے گی۔ یہ پابندی سابقہ حکومت کی طرف سے نافذ کردہ ایک مارشل لا ریگولیشن کے تحت لگائی گئی تھی۔ موجودہ عسکری حکومت نے سابقہ حکومت کے کئی فیصلوں میں ردّ و بدل کیا تھا اس لئے توقع تھی کہ یہ پابندی بھی اٹھا دی جائے گی۔ یہ توقع محض قیاسی نہیں تھی۔ اربابِ اقتدار کی طرف سے اس قسم کے بیانات۔ اور اعلانات شائع ہو رہے تھے کہ یہ پابندی عنقریب ختم کر دی جائے گی اور نئی درسگاہیں کھولنے کی نہ صرف اجازت دی جائے گی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ یہ پابندی اٹھا بھی دی گئی لیکن صرف۔ سکولوں کی حد تک۔ کالجوں پر یہ پابندی بدستور قائم رہی اگرچہ عام اطلاع یہی تھی کہ کالجوں پر پابندی بھی عنقریب اٹھا دی جائے گی۔ چنانچہ اتنا عرصہ اسی امید اور انتظار میں گذر گیا ہے۔ اس وقت حالات کا جو جائزہ لیا گیا ہے اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں اس پابندی کے اٹھ جانے کی امید نہیں۔

(۲) جیسا کہ میں نے اپنے مذکورہ بالا اعلان میں کہا تھا، اگر یہ پابندی اُٹھ بھی جائے تو اگلا سوال تعمیرات کے اخراجات کا سامنے آئے گا۔ اس دوران میں، یہ اخراجات اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ اتنی وسیع عمارات کی تعمیر کے اخراجات برداشت کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہوگی۔

(۳) تیسرا اور ان دونوں سے بھی زیادہ اہم سوال میری عمر کا ہے۔ اگر کچھ عرصہ پہلے یہ کالج وجود میں آجاتا تو میں اسے ایسی پٹڑی پر ڈال دیتا کہ پھر وہ رواں دواں آگے بڑھتا چلا جاتا، اور میرے زیرِ تعلیم اور تربیت ایسے طلبا تیار ہو جاتے جو نہ صرف درس و تدریس، بلکہ تالیف و تصنیف اور تحقیق و تبلیغ کے فرائض انجام دینے کے بھی اہل ہو جاتے۔ اب میری عمر اسّی برس کے قریب ہونے کو آئی ہے۔ کیا معلوم اب میں کتنا عرصہ اور زندہ رہ سکوں۔

(۴) ان تمام حالات کا نہایت ٹھنڈے دل سے جائزہ لینے کے بعد قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی نے باصد دلِ ناخواستہ فیصلہ کیا ہے کہ (غیر معیّنہ مدت تک) مزید انتظار سے کام رہے، اس لئے کالج کی مجوزہ سکیم کو ترک کر دینا چاہیئے۔ لکھنے کو تو میں نے یہ چار لفظ لکھ دیئے ہیں لیکن اس سے ـــــ گذر رہی ہے جو دل پر کسی کو کیا معلوم! ـــــ لیکن قرآنِ کریم نے ہمیں جذبات سے مغلوب ہو جانے کے بجائے، حقائق کا سامنا کرنا سکھایا ہے۔ جن موانعات کا دُور کرنا ہمارے بس میں نہ ہو انہیں صبر و سکون کے ساتھ انگیز کر لینا چاہیئے۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر سکیم کامیاب ہو سکتی۔ سکیمیں ہیں جو نہایت حسن تدبر سے اختیار کی جاتی ہیں لیکن ، غیر متوقع موانعات کی وجہ سے ناکام رہ جاتی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری سکیم ، کسی قسم کی بددیانتی یا خیانت کی وجہ سے ناکام نہیں ہوئی۔ موانعات ایسے تھے جن کا ازالہ ہمارے بس میں نہیں تھا۔

(۵) کالج سکیم کے ترک کر دینے کے بعد ، سوال ان عطیات کا سامنے آتا ہے جو اس مقصد کے لئے موصول ہوتے رہے ہیں۔ قاعدہ کی رو سے عطیہ واپس نہیں مانگا جا سکتا ، لیکن جس مقصد کے لئے معطیان نے یہ عطیات پیش کئے تھے ، جب وہ ناقابل حصول قرار دیا گیا ہے ، تو امانت اور دیانت کا تقاضا ہے کہ جو معطیان چاہیں انہیں ان کے عطیات واپس دیدیئے جائیں۔ یہ عطیات قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے حساب میں بینک میں جمع ہیں اور ضابطہ کی رو سے وہی ان کے تحفظ کی ذمہ دار ہے ، لیکن چونکہ احباب نے یہ عطیات میرے اعتماد پر دیئے تھے اور میں اس سوسائٹی کا چیئرمین بھی ہوں اس لئے میں اس ذمہ داری کو اخلاقاً اپنے اوپر بھی محسوس کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ خدا کے حضور اس سے سبکدوش ہو کر جاؤں۔ سوسائٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ جو معطیان اپنے عطیات واپس لینا چاہیں ، انہیں عطیات واپس کر دیئے جائیں۔ اس پیشکش سے میں اپنی ذمہ داری سے سرخرو ہو گیا ہوں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

(۶) عطیات کے مطالبہ کا طریق کار حسب ذیل ہوگا :-

(ا) جن احباب نے اپنے عطیات قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کو براہ راست بھیجے تھے ، وہ اپنے مطالبہ کا خط ، سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ 25/B گلبرگ ۲ لاہور) کے نام براہ راست بھیج دیں۔ اس میں عطیہ کی رقم کے علاوہ اس رسید کا نمبر اور تاریخ بھی درج ہونی چاہیئے جو اس عطیہ کے موصول ہونے پر جاری کی گئی تھی۔ اگر وہ رسید موجود نہ ہو ، تو طلوع اسلام کے جس شمارہ میں وہ فہرست شائع ہوئی تھی جس میں وہ عطیہ درج تھا اس کا حوالہ دیدیا جائے۔ مطالبہ خود معطیان کی طرف سے آنا چاہیئے۔

(ب) اگر کسی صاحب نے اپنا عطیہ طلوع اسلام کی کسی بزم کی معرفت بھیجا ہو ، تو وہ اپنا مطالبہ متعلقہ بزم کی وساطت سے بھیجیں اور وہ بزم ضروری حوالہ کے بعد ، مطالبہ سوسائٹی کو بھیج دے۔

(ج) عطیہ کی رقم (احتیاطاً) کراس چیک کے ذریعے بھیجی جائے گی کہ یہی طریق زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔

(د) بیرونی ممالک سے معطیان نے جو عطیات بھیجے تھے وہ ہمیں یہاں پاکستانی کرنسی میں موصول ہوئے تھے۔ ہم ان رقوم کو پاکستانی کرنسی ہی میں ادا کر سکتے ہیں۔ بیرون پاکستان رہنے والے حضرات اس سے بھی مطلع فرمائیں کہ انہیں کس طرح یہ رقوم ادا کی جائیں۔

(۷) آخر میں ، میں ان جملہ احباب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس سکیم کے سلسلہ میں کسی انداز سے بھی اعانت کی ہے اس کا احساس میرے قلب کی گہرائیوں میں ہے اور اس شکریہ کے لئے مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔

(۸) ان عطیات کی واپسی کا فیصلہ کالج سکیم تک محدود ہے۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے دیگر مقاصد اس سے متاثر نہیں ہوتے۔ جہاں تک قرآنک ریسرچ سنٹر کا تعلق ہے احباب کو اپر ٹیبو ہاؤسنگ سوسائٹی اسے اپنے ذرائع سے تعمیر کرا دے گی۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میری زندگی کا مقصد (بلکہ خود زندگی) ہے۔ لہٰذا جب تک خدا مجھے مہلت دیگا میں اس مشن کی سرانجام دہی کیلئے مصروفِ عمل رہونگا۔ اب اس کے لئے کیا پروگرام ہوگا یہ سوال سردست میرے زیر غور ہے۔ والسلام

پرویز

(چیئرمین قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی)

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۲۸ مارچ تا ۱۶ اگست ۱۹۸۲ء)

محترم

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
۱۔ شاہنواز صاحب، لورپول، یوکے	روپے ۲۰/-	۴۰۴۳/۱۳۲
۲۔ عزیز احمد صاحب معرفت عظمت انٹرنیشنل انڈسٹریل فنانس کارپوریشن گوجرانوالہ	۲۵/-	۴۰۴۴
۳۔ ڈاکٹر انور علی صاحب نواب منزل U.S.A (FL-33433)	۴۰/-	۴۰۴۵
۴۔ محترمہ مسز زبیدہ مشرف صاحبہ، اسلام آباد	۱۰۰/-	۴۰۴۶
۵۔ " مسز ظفر سعید صاحبہ، سیالکوٹ	۳۰۰/-	۴۰۴۷
۶۔ سید معصوم علی شاہ صاحب، معرفت قریشی سنز۔ اچھرہ لاہور	۱۰۰/-	۴۰۴۸
۷۔ محترمہ مسز زبیدہ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۴۰۴۹
۸۔ " مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۴۰۵۰
۹۔ ملک ظہور احمد صاحب۔ راولپنڈی	۱۰۰/-	۴۰۵۱/۱۳۳
۱۰۔ محترمہ نرگس صاحبہ۔ معرفت ملک ظہور احمد صاحب۔ راولپنڈی	۱۵۰/-	۴۰۵۲
۱۱۔ " ڈاکٹر ایچ یاور صاحبہ۔ معرفت بزم طلوع اسلام۔ راولپنڈی	۵۰۰/-	۴۰۵۳
۱۲۔ " مسز زبیدہ مشرف صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰/-	۴۰۵۴
۱۳۔ " نسیم اختر صاحبہ والدہ عثمان علی صاحب لاہور کینٹ	۵۰/-	۴۰۵۵
۱۴۔ " بیگم فرحت شہاب الدین صاحبہ کراچی	۱۰۰/-	۴۰۵۶
۱۵۔ محمد اسلم قریشی صاحب۔ ایلم پارک معرفت بزم طلوع اسلام لندن	روپے ۱۰۴۳/۷۲	۴۰۵۷
۱۶۔ محمد یوسف صاحب بذریعہ روشن عباسی صاحب لندن معرفت بزم طلوع اسلام لندن	۱۰۴/۲۸	۴۰۵۸
۱۷۔ ڈاکٹر کیپٹن محمد عبد الحفیظ صاحب۔ گوجرہ	۱۲۰۰/-	۴۰۵۹
۱۸۔ محترمہ مس ممتاز مجید صاحبہ۔ ملتان	۳۰۰/-	۴۰۶۰
۱۹۔ ڈی۔ وائی۔ شیخ صاحب۔ معرفت بزم طلوع اسلام کراچی	۱۰۰۰/-	۴۰۶۱
۲۰۔ محترمہ بیگم چوہدری عبد الکریم صاحبہ۔ ننکانہ صاحب	۳۰۰/-	۴۰۶۲
۲۱۔ اشفاق احمد صاحب مڈل برا معرفت بزم طلوع اسلام لندن	۱۱۵/۵۰	۴۰۶۳
۲۲۔ شرافت حسین صاحب کرالے بذریعہ محمد اکبر خان صاحب معرفت بزم طلوع اسلام لندن	۱۰۳/۵۰	۴۰۶۴
۲۳۔ غلام احمد قریشی صاحب برمنگھم۔ معرفت بزم طلوع اسلام لندن	۱۰۳/۵۰	۴۰۶۵
۲۴۔ محمد اکبر خان صاحب۔ برمنگھم۔ معرفت بزم طلوع اسلام لندن	۱۰۳/۵۰	۴۰۶۶

میزان ۶۹۴۸/-

سابقہ میزان ۷,۳۶,۴۲۸/۳۳

کل میزان ۷,۴۳,۳۷۶/۳۳

حقائق و عبر

۱۔ حاکمیت صرف خدا کی

ذیل کے اقتباس کا غور سے مطالعہ کیجئے:۔

قرآنی حاکمیت کا مطلب اس کا تصورِ توحید ہے، یعنی صرف قرآن کی حاکمیت اور باقی سب کی نفی ——— اگر کوئی شخص قرآن کی حاکمیت کے ساتھ ساتھ کسی اور کی حاکمیت کا بھی قائل ہے۔ کچھ منشاء اللہ کی چلتی ہے اور کچھ کسی دوسرے کی، تو اللہ تعالٰے فرماتے ہیں، مجھے اس کی ضرورت نہیں، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ منشاء بھی صرف میری ہو اور رضا بھی میری ہی ہو ——— اس کے علاوہ جو تصور بھی موجود ہو گا توحیدی تصور نہ ہو گا، شرکیہ ہو گا!

حاکمیت کے سلسلہ میں ایک اور اہم ترین بات یہ ہے کہ حاکمیت کسی کو تفویض نہیں کی جا سکتی کہ حاکم خود ہی اس کا مالک ہوتا ہے اور وہ کسی اور کو یہ حاکمیت تفویض نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ یہ حاکمیت اللہ تعالٰے اپنے نبی کو بھی تفویض نہیں کرتے۔

یہ، طلوعِ اسلام کے کسی مقالہ کا اقتباس نہیں۔ یہ ماہنامہ محدث (لاہور) کے مدیرِ اعلیٰ، جناب حافظ عبدالرحمٰن صاحب مدنی کی ایک تقریر کا اقتباس ہے جو اسی ماہنامہ کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۸۲ء (صفحہ ۵) میں شائع ہوا ہے ——— ایک مولانا صاحب کی طرف سے اس کا اعتراف ——— اور مولانا صاحب بھی اہلِ حدیث کے ایک ممتاز رکن! بیساختہ غالب یاد آ گیا جس نے کہا تھا کہ ؎

صند کی ہے اور بات، مگر خُو بُری نہیں   بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

—(۰)—

۲۔ دوا کا نہیں، اب دعا کا وقت ہے

روزنامہ مشرق (لاہور) کی ۲؍ اگست ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

ملا ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ، ناظمِ اعلیٰ انجمن ترقی اُردو نے ایک بیان میں کہا ہے کہ اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں جو اقدامات کئے گئے ہیں یا کئے جا رہے ہیں، انجمن ترقی اُردو کے نزدیک وہ نا کافی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض بالا دست حلقے اُردو کو ۱۹۸۹ء تک سرکاری زبان قرار دینے کے آئینی فیصلہ پر عمل درآمد کو ٹالنا چاہتے ہیں۔ اس لئے انجمن ترقی اُردو نے

عوام سے یہ اپیل کی ہے کہ ۱۴ اگست کو خصوصی نماز ادا کی جائے جس میں اُردو کو سرکاری زبان بنانے کے لئے دعا کی جائے۔

یہ درخواست اُن دعاؤں کا اثر دیکھنے کے بعد کی جا رہی ہے جو گذشتہ پچیس سال سے تمام عالمِ اسلام مغضوب علیہ اسرائیل کے خلاف مانگتا چلا آ رہا ہے! ——— بے ماندگی شوق تراشے ہے پناہیں!!

——— (٠) ———

۳۔ گھر کا بھیدی

اسلامی نظریاتی کونسل نے ملک کے سیاسی ڈھانچے کے متعلق اپنی رپورٹ صدرِ مملکت کی خدمت میں ارسال کر دی۔ صدرِ مملکت نے اسے نظرِ ثانی کے لئے کونسل کو واپس بھیج دیا۔ رپورٹ نہ کونسل نے عام کی تھی، نہ صدرِ مملکت نے۔ لیکن وہ دوسرے ہی دن (اسلام آباد کے انگریزی روزنامہ "دی مسلم" کی وساطت سے) ملک میں عام ہو گئی۔ روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۸ جولائی ۱۹۸۲ء میں ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ (بی بی سی کے تبصرہ کے مطابق)

اس رپورٹ کے مسودہ کو کونسل کے ایک ناراض رکن نے اخبارات تک پہنچایا ہے۔

یہ حالت ہے کونسل کے ان ارکان کی جنہیں ان کے تقویٰ، پرہیزگاری، امانت و دیانت، اعتماد کی بنا پر، کونسل کی رکنیت کے لئے نامزد کیا گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ سیاسی ڈھانچے کا مسودہ تھا ——— کسی ایٹمی تنصیب کا پلان نہیں تھا۔

——— (٠) ———

۴۔ عورت کی کمتری کا سبب

روزنامہ جنگ (لاہور) کی یکم اگست ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں ایک صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے (بزعمِ خویش) ثابت کر دیا ہے کہ عورت مرد سے کمتر ہے۔ باقی دلائل تو وہی تھے جنہیں عام طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن دو ایک بالکل نادر اور منفرد ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عورت کا ایمان بھی ناقص ہے اور عمل بھی۔ اس پر صحابہ کرام نے فرمایا کہ وہ کیسے؟ تو آپ نے وضاحت فرمائی کہ عورت کا ایمان اس لئے ناقص ہے کہ وہ سال میں پورے مہینے اور مہینے میں پورے دن ایمان پر قائم نہیں رہتی۔ یعنی ایامِ حیض میں نہ تو وہ نماز پڑھ سکتی ہے اور نہ ہی روزہ رکھ سکتی ہے۔ جبکہ مرد کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ پورا مہینہ، پورے سال نماز بھی پڑھ سکتا ہے اور روزے بھی رکھ سکتا ہے۔ عمل کے اعتبار سے ایک مرد کی گواہی، دو عورتوں کی گواہی کے برابر ہے۔

اور یہ اُسی ایمان اور عمل میں ناقص عورت کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کی بابت ارشاداتِ الٰہیہ ہیں (؟) ... کے قول کے

مطابق، رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ اس کے (یعنی ماں کے، جو بہرصورت عورت ہی ہوتی ہے) پاؤں کے نیچے جنّت ہے۔ باپ کے متعلق آپؐ نے ایسا نہیں فرمایا۔

لیکن ان صاحب کی ایک اور دلیل، فی الواقعہ بے مثال ہے۔ فرماتے ہیں:-

"ڈاڑھی رکھنا سنّتِ نبویؐ ہے۔ اور یہ سنّت صرف، اور صرف مرد ہی پوری کر سکتا ہے، عورت نہیں۔"

اخبار میں مراسلہ نگار کا اسمِ گرامی "شیخ ایم اے دلچسپ" لکھا ہے۔ اگر یہ کتابت کی غلطی نہیں تو یہ صاحب واقعی بڑے دلچسپ واقعہ ہوئے ہیں۔ قوم کو ان کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ وہ ملک کی اس قدر حارّ و یابس فضا میں، جبکہ ہنسی تو ایک طرف، مسکراہٹ تک کے لئے بھی کوئی موقعہ نہیں ملتا، اس قدر تفریح کا سامان فراہم کر رہے ہیں!

(۱)

۵۔ پاگل انسان

خالقِ کائنات نے، انسان کو فطرت کی قوتیں مسخر کر لینے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے لیکن (اس کے ساتھ ہی) خدا پر ایمان رکھنے والوں (مومنین) سے کہا ہے کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کر کے، اقدارِ خداوندی کے مطابق، نوعِ انسان کی منفعت کے لئے استعمال کریں۔ لیکن جو قوم ان قوتوں کا، اقدارِ خداوندی سے بے باک ہو کر استعمال کرے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کی شہادت دورِ حاضر کا ذرّہ ذرّہ دے رہا ہے جو انسانیت کا مقتل ہے۔ اس نے اس طریقِ استعمال کی ابتداء، دوسری جنگِ عظیم کے آخر میں، ان دو بموں سے ہوئی تھی جنہیں امریکہ نے، جاپان کے سوختہ بخت شہروں (ہیروشیما اور ناگاساکی) پر گرایا تھا۔ ایک رپورٹ کے مطابق، ان دو بموں سے، قریب دو لاکھ انسانوں کے پرخچے اڑ گئے تھے، اور جو زندہ بچے تھے وہ جن جانسوز اور لاعلاج امراض میں مبتلا چلے آ رہے ہیں، ان کا تصور بھی روح کو تھرّا دیتا ہے۔

یہ ۱۹۴۵ء کی بات تھی۔ اس کے بعد ان پاگل انسانوں نے کس قدر ترقی کر لی ہے، اس کے متعلق ہارورڈ یونیورسٹی کے ڈاکٹر (HOWARD A. HIATT) نے لکھا ہے کہ اگر بیس میگاٹن کا ایک بم، امریکہ کے شہر بوسٹن پر گرا دیا جائے تو اس سے چار میل کے دائرے کے اندر کا سارا علاقہ تباہ ہو جائے گا اور قریب سات لاکھ چالیس ہزار انسان ہلاک ہو جائیں گے۔ بیس میل کے فاصلے پر، پٹرول وغیرہ کے ذخیروں میں اس شدت سے شعلہ فشانی ہوگی کہ اس علاقہ میں قریب پندرہ لاکھ جانیں ضائع ہو جائیں گی۔ اس دھماکہ کی چمک سے چالیس میل کے فاصلہ تک کے انسان اندھے ہو جائیں گے۔

(بحوالہ ڈان۔ کراچی)

یہ نتیجہ ہوگا بیس میگاٹن کے ایک بم کے دھماکے کا! اُف! یہ خدا فراموش انسان کی ہلاکت سامانیاں!

(۰)

۶- دوسری طرف

(ا) روس میں ایک ایسی مشین تیار کی گئی ہے جس کو رات کو سوتے وقت اپنے کمرے میں چارپائی کے سرہانے رکھ لیں۔ اس کا سوئچ بجلی میں لگا دیں اور بٹن دبا کر سو جائیں تو آپ جو بھی خواب دیکھیں گے، صبح کو وہ خواب بمعہ تصویر آپ کو نظر آجائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مشین کی قیمت ساڑھے نو لاکھ روپے کے قریب ہوگی اور جلد ہی پاکستان آجائے گی۔ (بحوالہ جنگ لاہور ۲۷ جولائی ۱۹۸۲ء)

(ا۱) آج تک، ہر شخص کی انفرادی شناخت کا ذریعہ اس کے انگوٹھے کی لکیریں سمجھی جاتی تھیں۔ یعنی یہ کہ دنیا کے کوئی دو انسان ایسے نہیں جن کی انگوٹھے کی لکیریں ایک جیسی ہوں۔ چنانچہ جرائم کی تفتیش اور مجرموں کی شناخت میں ان لکیروں سے بڑا کام لیا جاتا ہے۔

لیکن اب ایک ماہرِ چشم (ROBERT HILL) نے دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کے کسی دو انسانوں کی نگاہ (LOOK) ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اس نے ایک ایسا کیمرہ ایجاد کیا ہے جس میں کسی کی نگاہ محفوظ کر لی جائیگی اور عندالضرورت دوسری نگاہ سے بتا دیا جائے گا کہ وہ اسی انسان کی نگاہ ہے جس کی نگاہِ اولیں محفوظ ہے یا کسی دوسرے کی ہے۔ اس سے (سب سے پہلے) بینکوں میں فراڈ کے مواقع (معدوم نہیں تو کم ضرور) ہو جائیں گے۔ اب مطالبہ کرنے والے کے دستخط نہیں ملائے جائیں گے۔ صرف اس کی نگاہ بتا دے گی کہ وہ اصلی کھاتہ دار ہے یا جعلساز ہے۔

کیمرہ بازار میں آجائے تو جعلساز اس کے توڑ کی ترکیب سوچیں گے اور ہمارے شعراء مضامین آفرینی کی۔

—— (۰) ——

۷- اسلامی نظام کی ایک جھلک

صدرِ مملکت نے پنجاب زکوٰۃ کنونشن (لاہور) میں ایک تقریر فرمائی تھی جو ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے جس سے واضح ہو جائیگا کہ صدرِ مملکت کے نزدیک اسلام کا معاشی نظام کس قسم کا ہے۔ فرماتے ہیں:-

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام مساوات کا دین ہے اس لئے فضل الحق صاحب کے پاس بھی سو روپے ہونے چاہئیں ضیاء الحق صاحب کے پاس بھی سو روپے ہونے چاہئیں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ قرآن کی طرف توجہ دیجئے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور ہمارا یہ دین ایمان ہے کہ اسلام کی روح قرآن اور سنتِ رسولؐ میں ہے تو آپ یہ بتایئے کہ اگر مساوات کا مسئلہ قرآن کے نظریہ کے اندر یہ ہوتا کہ کوئی غریب نہیں ہوگا۔ کوئی مسکین نہیں ہوگا تو پھر قرآن میں اس کا ذکر کیوں آیا ہے۔ یہ آپکے سوچنے کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخیر حضرات سے کہا ہے کہ اپنے اموال میں سے ایک مقررہ رقم[1] ان لوگوں کو دیں جو اس کے مستحق ہیں۔

(الاعتصام ۹ جولائی ۱۹۸۲ء)

[1] مقررہ رقم کا حکم خدا نے کہیں نہیں دیا۔ (طلوعِ اسلام)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جن مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
		نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں -
لاہور	جمعہ ۸ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD. TEL: 553-1896
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر -	(بمقام) 60. HERICK RD. SALTLEY, B8 1NT.
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا تیسرا سنیچر شام ۶ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311, DOWNS VIEW, TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3- PHONE (416) 661-2827
کراچی نمبر ۲	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ نمبر ۲۲ بارون چیمبرز مالطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون: ۲۲۸۸۲۸
پشاور	۱۔ ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲۔ ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب - رفیقی لین صدر (OPP. VIP. MAIN GATE) پشاور سٹیشن بازہ روڈ فون ۴۲۷۵۹ ہوٹل نعمت کدہ - یونیورسٹی روڈ - جہانگیر آباد -
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف - محمود علی صاحب - اتمانخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۲۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس - شہید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب - واقع 234-K-L کیہال (ایبٹ آباد)
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، مکان نمبر ۴ - نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ - غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد معظم خان صاحب -
چکوال	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، نزد ہجویری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام -
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر ترقی روڈ - باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائش گاہ: چوہدری مقبول شوکت - گل روڈ - سول لائنز -
گجرات -	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۱۲/۲۰ بی، بھمبر روڈ ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون: ۳۱۰۷۱)
مجلس تحصیل کبیر والا ملتان	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام مطب حکیم احمد دین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۹۷)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۴ بجے بعد دوپہر	بمقام حیات سرجری کلینک پ/۲۳ پیپلز کالونی نمبر ۱ (فون: ۲۸۵۵۴)

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

(قسط ۲)

پرویز

طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۸۲ء میں، اس نہایت اہم مقالہ کی قسط اوّل شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا بقایا حصہ پیشِ خدمت ہے۔ اقوامِ سابقہ کی اس تاریخ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ قومیں یونہی ہنگامی طور پر زوال پذیر یا تباہ نہیں ہو جاتیں۔ ایسا خدا کے متعیّن کردہ قوانینِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہوتا ہے۔ اور مقصد اس تذکرہ سے یہ ہوتا ہے کہ ہر قومِ مخاطب اپنی حالت کا جائزہ لے لے کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ قومِ فرعون کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے۔ اب آگے ملاحظہ فرمائیے۔

(۰)

قوم بنی اسرائیل

اور اب ہم اس قوم کی طرف آتے ہیں جسے فرعون کے مظالم سے رستگاری کے بعد آزادی کی نعمت سے نوازا گیا تھا۔ قرآن کریم نے اس قوم کی داستان بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہے اور ان کے تمام جرائم کو ایک ایک کر کے گنایا ہے جن کے نتیجہ میں وہ شوکت و حشمت کی اس قدر بلندیوں تک پہنچنے کے بعد، اس طرح ذلیل و خوار ہوئی کہ دنیا کی کسی قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قرآن نے سب سے پہلے یہ کہا ہے کہ چونکہ اس قوم کو یہ مملکت، محض ان کے تاجدار حضرت موسیٰؑ کے دعویٰ کی صداقت اور بلندیٔ سیرت و کردار کی بنا پر بیٹھے بٹھائے مل گئی تھی، اس لئے اسے اس کی قدر ہی نہیں تھی۔ وہ (تورات کے الفاظ میں) قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ سے جھلا جھلا کر کہتے تھے کہ "تو ہمیں کہاں مرنے کے لئے لے آیا ہے۔ ہم مصر میں بہت اچھے تھے۔ مصریوں کی ہانڈیاں پکاتے تھے اور من بھر کر روٹی کھاتے تھے۔ ہم سے ہاتھ اٹھا کہ ہم پھر وہیں چلے جائیں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا، بیابان میں مرنے سے ہزار درجے بہتر ہوگا۔"

عدم گنجائشِ مانع ہے ورنہ تفصیل سے بتایا جاتا کہ بنی اسرائیل کی غلامی، غلامی کے بعد آزادی اور (اس طرح مفت میں ملی ہوئی آزادی) کے بعد ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت اور اس کے عبرت آموز مظاہرے۔ کس طرح ہماری آزادی اور آزادی کے بعد ہماری

بنی اسرائیل اور ہم

حالت کے ہو بہو عکس ہیں۔ اس داستان کو پڑھیئے تو یوں نظر آتا ہے کہ مکان و زمان کی

تبدیلی کے ساتھ وہ گویا خود ہماری کہانی ہے۔

بہرحال، جب حضرت موسیٰؑ، ان کی اس قسم کی حرکتوں سے تنگ آ کر خدا سے فریاد کرتے کہ اس قسم کی قوم کا کیا کروں، تو انہیں جواب ملتا کہ یہ قوم غلامی کی فضا میں پرورش یافتہ ہے، اس لئے ان کی ذہنیت بدلتے ہی بدلے گی۔ تم ان کے بڑے بوڑھوں کو تو مرنے دو، لیکن ان کی آنے والی نسل کی پرورش اور تربیت اپنے زیرِ نگرانی کرو، چنانچہ حضرت موسےؑ نے ایسا ہی کیا، اور جب یہ نئی نسل پروان چڑھی تو اس نے مملکتِ خداداد کو مستحکم ہی نہیں بلکہ اسے سطوتِ داودی اور شوکتِ سلیمانی سے اس طرح ہمکنار کیا کہ ان کے عروج اور ترقی کی چمک دمک سے ایک عالم کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن اس کے بعد جب اس قوم میں وہ خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں جو دولت اور قوت کے غلط استعمال کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں تو وہ اس طرح تباہ ہوئی کہ اسکی نظیر بھی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ ان کی پہلی تباہی، بابل کے بادشاہ، بخت نصر کے ہاتھوں (قریب ۵۸۶ ق م میں)، اس طرح ہوئی کہ اس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور عام قتل و غارت گری کے بعد، جو یہودی باقی بچے، انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر بابل لے گیا۔ جہاں وہ قریب ایک سو سال تک غلامی کی بدترین مصیبتوں کا شکار رہے۔ لیکن انہیں بازآفرینی کا ایک اور موقعہ دیا گیا اور ایران کے خدا ترس حکمران، سائرس (ذوالقرنین) نے، انہیں بابل کی غلامی سے رہائی دلا کر، دوبارہ یروشلم میں لا بسایا۔ اس کے بعد، انہیں پھر وہی خرابیاں عود کر آئیں تو آخری حجت کے طور پر، ان کی طرف حضرت عیسٰیؑ جیسا عظیم پیغامبرِ انقلاب مبعوث ہوا۔ لیکن انہوں نے جب ان کی دعوت کی مخالفت کی اور اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو ان کی آخری تباہی، رومیوں کے گورنر ٹائیٹس کے ہاتھوں (۷۰ء میں)، اس طرح عمل میں آئی کہ وہ قریب دو ہزار سال تک خانماں خراب، بے گھر بے در، زمانے کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ تاآنکہ اب انہیں مغربی طاقتوں کے تصدق، دھاندلی سے فلسطین میں رہنے کا ٹھکانہ ملا۔

خرابیوں کی فہرست

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، قرآن کریم نے ان کے جرائم کی فہرست بڑی تفصیل سے دی ہے لیکن بغرضِ اختصار، یہاں ان میں سے صرف ان جرائم کو سامنے لایا جاتا ہے جو زیادہ نمایاں تھے۔ مثلاً:۔

(۱) ان کے معاشرہ کی بنیاد سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر تھی۔ (۹/۳۴)

(۲) نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ربٰو پر ہوتی ہے۔ یعنی اس اصول پر کہ معاوضہ محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ربٰو کا چلن عام تھا حالانکہ ان کے رسولوں نے انہیں اس سے سختی سے روکا تھا۔ (۴/۱۶۱)

(۳) ربٰو کے علاوہ، وہ دوسروں کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہتھیا لیتے اور ہضم کر جاتے تھے (۴/۱۶۱؛ ۹/۳۴) اس سلسلہ میں، ان کی ہوسِ زر پرستی کس حد تک پہنچ چکی تھی، قرآن کریم نے اسے اس مقدمہ کے ضمن میں بیان کیا ہے جو حضرت داؤدؑ کے سامنے پیش ہوا تھا۔ مدعی کی فریاد یہ تھی کہ مدعا علیہ مجھے کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں اور ہے بھی یہ بھائی۔ اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ یہ میرا بھائی مجھ سے کہتا ہے کہ تم یہ ایک بھیڑ بھی مجھے دیدو۔ تم نے اسے رکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ تھی اس قوم کی ذہنیت یا ان کا معاشی نظام۔

(۴) غریبوں اور محنت کشوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی سمٹ سمٹا کر سرمایہ داروں کے دل میں اگر کبھی کوئی کھٹک پیدا ہوتی تھی تو مذہبی پیشوا انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے تھے کہ تم صدقہ و خیرات سے جو نیکی کے کام کرتے ہو، ان کا ثواب بہت بڑا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی اس خود فریبی کی بڑے دل نشین انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم پہلے اپنے ہاں کے غریب اور کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لاتے ہو۔ اور

اپنے دل میں خوش ہوجاتے ہو کہ ہم نے بہت بڑا ثواب کا کام کیا ہے اور اسے فراموش کر دیتے ہو کہ جس مصیبت میں یہ غریب گرفتار ہیں اس کے ذمے دار تم خود ہو۔ یاد رکھو تمہارے صدقہ وخیرات کے اس قسم کے کام اس جرم کا کفارہ کبھی نہیں بن سکتے۔ تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل وخوار ہوگے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا۔ (۲/۸۵)

(۵) معاشرہ میں جو برائیاں پیدا ہو جاتی تھیں نہ تو وہ ایک دوسرے کو ان سے روکتے تھے (۵/۷۹)، اور نہ ہی ان کے مذہبی پیشوا انہیں ان سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ (۵/۶۳) کیونکہ ان کے اپنے مفاد ان کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے۔

(۶) ان کے اکابرینِ ملت (لیڈرانِ کرام) کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کاموں پر ان کی تعریف کریں جو وہ کر کے نہ دکھائیں لوگ ان کی تعریف میں قصیدے پڑھتے رہتے تھے اور وہ ان قصیدوں کو سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ (۳/۱۸۷)

(۷) مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے علماء و مشائخ کو اپنا خدا بنا رکھا تھا (۹/۳۱) کسی کو ان کے فیصلوں سے مجالِ سرتابی نہ تھی۔

(۸) عوام کی یہ حالت تھی، اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی یہ کیفیت کہ:۔

ا۔ وہ غرور، نفرت، اور تکبر و تمرد کے پیکر تھے۔ ان سے اگر کوئی علم وعقل کی بات کی جاتی تو وہ اسے یہ کہہ کر دھتکار دیتے کہ ہمارا علم مکمل ہے ہمیں کسی سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ (۲/۸۸)

ب۔ مذہب ان کا پیشہ تھا اور وہ چند ٹکوں کی خاطر جس قسم کا چاہو فتوے دے دیتے تھے (۵/۴۱)، پھر تماشہ یہ کہ وہ ان فتووں کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے۔ لیکن لوگوں سے کہتے یہ تھے کہ یہ خدا کی شریعت ہے جسے ہم تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (۲/۷۹)

ج۔ اسی دین فروشی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی تھی کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں اس لئے وہ ہر اس آواز کو سختی سے دبا دینے کی کوشش کرتے تھے جو لوگوں کو حق و صداقت کی طرف دعوت دے۔ (۹/۳۴)

د۔ وہ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں ہمیشہ سر پھٹول ہوتی رہتی تھی اور ان کی یہ فرقہ بندی اور اختلاف انگیزی کسی اصول کی بنا پر نہیں تھی بلکہ باہمی ضد اور رقابت کی وجہ سے تھی (۲/۲۱۳) ان کا سارا وقت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے میں صرف ہو جاتا تھا۔ (۲/۱۱۳)

ہ۔ وہ جو کچھ دوسروں سے کہتے اس پر خود کبھی عمل نہیں کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی کیفیت بس یوں سمجھئے جیسے کسی نے گدھے پر مقدس کتابوں کا انبار لاد دیا ہو۔ (۶۲/۵)

س۔ وہ لوگوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرو، جنت تمہارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ تم کبھی جہنم میں نہیں جاؤ گے اور اگر کسی وجہ سے تمہیں جہنم میں بھیج بھی دیا گیا تو تمہارے بزرگ فوراً جا کر تمہیں چھڑا لائیں گے (۲/۸۰)، تم تو خدا کی چہیتی اولاد ہو، وہ تمہیں کیسے جہنم میں ڈال دے گا۔ (۵/۱۸)

(۹) قوم کو اعمال سے بیگانہ بنا دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ قانون اور ضابطہ کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر شاق گزرتی تھیں، مثلاً انہیں کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن کاروبار کا ناغہ کیا کرو (جسے سبت کہتے ہیں) تو وہ ایسے حیلے اختیار کرنے لگ جاتے جن سے وہ کسی نہ کسی طرح اس پابندی سے بچ جائیں۔ قانون کی طرف سے گریز کی راہیں نکالنا ان کا عام معمول بن چکا تھا۔ (۲/۶۵، ۷/۱۶۳-۱۶۴)

(۱۰) ظاہر ہے کہ جس قوم کی حالت یہ ہو چکی ہو، وہ کسی بلند مقصد کی خاطر ذرا سی قربانی بھی نہیں دے سکتی، اور جب وہ کسی چھوٹی موٹی قربانی کے لئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتی تو حق کی خاطر جان دینے کا تو ان کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کیفیت ان کی یہ تھی کہ موت کے نام سے ان کی جان جاتی تھی (۲/۹۶ و ۲/۲۴۳) نتیجہ یہ کہ ان کی ہزاروں لاکھوں کی جمعیت باہر نکلتی تھی لیکن جب دشمن سامنے سے آتا دکھائی

دیتا تو وہ بھیڑوں، بکریوں کی طرح بھاگ اٹھتے اور ذلت کی موت مرجاتے۔ (۲/۲۴۴)

(۱) اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں، اور تو اور، فوج کی جرنیلی کا معیار بھی دولت بن چکا تھا۔ یعنی ان مناصب کے لئے امیروں اور رئیسوں کے لڑکے منتخب کئے جاتے تھے۔ جوہر ذاتی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ (۲/۲۴۷) اور سپاہیوں میں ڈسپلن اس حد تک مفقود تھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کچھ وقت کے لئے پیاس کو روکو، پانی مت پیو تو وہ اتنی سی پابندی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے (۲/۲۴۹)

یہ تھی اس قوم کی حالت جب خدا کی آخری نبوت اور بنی اسرائیل کا آخری پیغامبر حضرت عیسیٰ ان کی طرف مبعوث ہوتے۔

حضرت عیسیٰ

حالت اُس وقت یہ تھی کہ یروشلم پر حکومت تو رومیوں کی تھی لیکن بنی اسرائیل پر اقتدار مذہبی پیشواؤں کا تھا۔ یہی وجہ ہے جو آپ انجیل میں دیکھیں گے کہ حضرت عیسیٰؑ کی تلقین و توبیخ کا سارا رُخ ہیکل کے انہی پجاریوں کی طرف تھا...... وہ ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ایک بیباک حق گو پیامبرِ انقلاب کی طرح اُن سے کہتے:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو، اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتلانے والو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر وہ مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو! کونسا بڑا ہے سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سولف اور زیرے پر دہ یکی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے...... اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔

کبھی ان سے کہتے:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری قبروں کی مانند ہو ______ جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوتی ہیں اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو...... اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟

(متی باب ۲۳۔ آیات ۱-۲۶)

اور وہ کبھی اپنے متبعین کو متنبہ کرتے کہ:

دیکھو، یہ فقیہ اور فریسی جو موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو...... وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے بڑے تعویذ بناتے ہیں اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ (ایضاً)

یہ تھی بنی اسرائیل کے علماء و مشائخ کی حالت، اور یہ تھا وہ مشن جسے لے کر حضرت مسیحؑ آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ مذہبی پیشوا جو خدا بنے بیٹھے تھے، اس تنقید کو کس طرح گوارا کر لیتے۔ انہوں نے حضرت مسیحؑ کے خلاف ایک متحدہ محاذ کھڑا کر لیا۔ وہ عوام کو تو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہارے عقاید خراب کرتا ہے لیکن ان کی مخالفت کی جو حقیقی وجہ تھی اس کی پردہ کشائی انجیل برناباس میں ان الفاظ میں

کی گئی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔ اس میں لکھا ہے۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سرداروں کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پہ بڑی مصیبت ہو گی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے ۔۔۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہو گا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیے کے طور پہ مانگیں۔

آپ نے غور کیا، عزیزانِ من! کہ مسئلہ سارا معاشی تھا جسے وہ مذہب کا نقاب اوڑھا رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے جو کہا وہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے، مذہبی پیشوائیت ہمیشہ سیکولر نظامِ حکومت سے خوش رہتی ہے کہ اس میں گورنمنٹ کا تعلق سیاسی امور سے رہتا ہے اور مذہبی امور کے دائرے میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اسکے برعکس دین کے نظام میں مذہبی اور سیاسی دونوں دائرے حکومت کی تحویل میں چلے جاتے ہیں اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:

اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کریں۔ بس اگر ہم نے غلطی کی تو بھی اللہ رحیم ہے۔ قربانی اور ہدیہ کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جا سکے گا جب تک وہ اللہ کی عبادت ویسے ہی نہ ہوتے دیکھے جیسی موسیٰ نے لکھی ہے۔ (انجیل برناباس ص ۲۱۲)

چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔ اس کے لئے انہوں نے حضرت مسیحؑ کے خلاف کفر و الحاد کا فتویٰ مرتب کیا اور اس جرم کی پاداش میں ان کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ وہاں کے مروجہ قانون کی رو سے ہیکل کے پجاری، موت سے کم ہر قسم کی سزا خود دے سکتے تھے۔ لیکن موت کی سزا کی توثیق حکومت سے کرانی پڑتی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے رومیوں کے گورنر سے فتویٰ پر دستخط کرالئے اور یہ نہ سمجھے کہ یہ حضرت مسیحؑ کا نہیں بلکہ خود ان کے اپنے قتل کا محضر نامہ (DEATH WARRANT) ہے جس پر وہ دستخط کرا رہے ہیں۔ وہ قتل نامہ بھی پر قریب ستر سال بعد (سنہ ۷۰ء میں) خود رومیوں ہی کے ایک اور گورنر ٹائیٹس کے ہاتھوں اس طرح عمل ہوا کہ نہ ہیکل رہا اور نہ ہیکل کے پجاری ۔۔۔ عذر لنگ جیسی داستان الحنت ہیں فطرت کی تعزیریں!

حضرت مسیحؑ جس قسم کا انقلاب لائے اس کی تفصیل قرآنِ کریم میں نہیں آئی۔ نہ ہی انجیل میں اس کی صراحت ملتی ہے البتہ ان دونوں میں ایسے اشارات ملتے ہیں جن سے اس انقلاب کی ایک خفیف سی جھلک سامنے آجاتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت مسیحؑ کے متبعین (حواریوں) نے آپ سے کہا کہ موجودہ نظام کی رو سے جو روٹی انسانوں کے ہاتھوں سے ملتی ہے وہ بڑی ذلت آمیز ہے۔ ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ رزق خدا کے ہاں سے ملے تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کا دست نگر اور محکوم نہ رہے۔ اس پر انہیں "آسمانی رزق" ملنے لگا۔ اس "آسمانی رزق" کے اشارات، انجیل میں مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔ انجیل متی (باب ۱۱ آیت ۲۸) میں ہے کہ حضرت مسیحؑ کی دعوت یہ تھی کہ:

اے محنت کشو! اے وہ جو تھکے ماندے ہو اور سب سے زیادہ بوجھ سے دبے ہوئے ہو، تم سب میرے پاس آؤ میں تمہیں آرام دوں گا۔

دوسری طرف وہ سرمایہ داروں سے کہتے ہیں کہ:

اپنے واسطے زمین پر مال و متاع جمع کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پہ مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا لگتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے ہیں اور چراتے ہیں ۔۔۔ یاد رکھو! تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ (متی ۶ : ۱۹-۲۴)

اس کے لئے انہوں نے جو عملی نظام قائم کیا تھا، اس کا نقشہ کتاب اعمال میں اس طرح کھینچا گیا ہے کہ :

اور جو ایمان لائے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے۔ وہ اپنی جائیداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (اعمال ۲: ۴۴-۴۵)

دوسری جگہ ہے :-

اور ایمان داروں کی جماعت ایک دل اور ایک جان تھی اور کوئی بھی اپنے مال کو اپنا نہیں کہتا تھا۔ ان کی سب چیزیں شریک تھیں ۔۔۔۔ اور ان سب پر فضل تھا کیونکہ ان میں کوئی بھی محتاج نہیں تھا۔ اس لئے کہ جو لوگ زمینوں اور گھروں کے مالک تھے ان کو بیچ بیچ کر بکی ہوئی چیزوں کی قیمت لاتے اور رسولوں کے پاؤں میں رکھ دیتے تھے۔ پھر ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق بانٹ دیا جاتا تھا۔ (اعمال ۴: ۳۲-۳۵)

یہ تھا وہ اقتصادی نظام جسے جناب مسیحؑ نے قائم فرمایا تھا۔

یہ تھیں اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں جنہیں قرآن کریم نے اپنی سب سے پہلی مخاطب قوم کے سامنے پیش کر کے ان سے کہا کہ یہ تاریخی شواہد تمہارے سامنے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ان اقوام کی اجڑی ہوئی بستیوں کے وہ کھنڈرات بھی جن کے پاس سے تم اکثر گزرتے رہتے ہو۔ تم انہیں بنظرِ غائر دیکھو اور سوچو کہ یہ تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ جس قوم میں اس قسم کے جرائم پیدا ہوئے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ قوم تباہ و برباد ہو گئی۔ یہاں تک تو تم تاریخی شواہد سے دیکھ سکتے ہو۔ اب اس کے بعد تم اس حقیقت کو سن لو کہ یہ کچھ محض اتفاقیہ طور پر نہیں ہو گیا۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو پہلے بھی کارفرما تھا اور آج بھی اسی طرح کارفرما ہے۔

قرآن کی مخاطب قوم

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۚ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۔ (۳۳/۶۲)

خدا کی وہ روش جو اقوام سابقہ کے سلسلہ میں کارفرما تھی: تو اس روش میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا!

تمہارا نظام بھی اسی قسم کا تخریبی ہے جیسا ان اقوام کا تھا۔ اس لئے اگر تم نے اسے تبدیل نہ کیا تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان اقوام کا ہوا تھا۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۔ (۳۴/۱۹) جس طرح وہ مٹ گئیں اور ان کی صرف کہانیاں باقی رہ گئیں اسی طرح تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری بھی فقط داستانیں باقی رہ جائیں گی۔ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ تم اپنے لئے کیا چاہتے ہو! شوکت و ثروت اور عزت و آبرو کی زندگی یا تباہی و بربادی کا ہولناک انجام! جن سعید نفوس نے اس پیغام کو بگوشِ ہوش سنا، انہوں نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا اور اس طرح وہ بتدریج جماعتِ مومنین وجود میں آگئی جس کا مقصدِ حیات ایسا نظام متشکل کرنا تھا جو مستقل اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو اور اس میں ان خرابیوں میں سے کوئی خرابی نہ ہو جن کا نتیجہ قرآن نے امتوں کی ہلاکت بتایا ہے۔ چنانچہ انہوں نے وہ نظام قائم کیا اور آسمان کی آنکھ نے جہاں یہ عبرتناک مناظر دیکھے تھے کہ غلط نظام کے ہاتھوں بڑی بڑی شوکت و سطوت کی مالک قومیں کس طرح راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح اس نے یہ درخشندہ و تابناک منظر بھی دیکھا کہ صحیح اقدارِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے سے کس طرح ایک اونٹ چرانے والی قوم چند ہی دنوں میں تہذیب و تمدن کی ان بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے جس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ اس قوم کے جلو میں کس طرح کاروانِ انسانیت رواں دواں اور شاداں و فرحاں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھے چلا جاتا ہے، اس سکون و اطمینان کے ساتھ کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۶۲) نہ اس قافلہ کو بیرونی

جماعتِ مومنین

حضرات کا کوئی خوف ستاتا ہے اور نہ ہی افرادِ کارواں کے لئے قلبی حزن و ملال وجۂ افسردگی اور موجب پریشانی بنتا ہے۔ طُوبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ۔

اس جماعت سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ وہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو ہر وقت سامنے رکھیں اور اس کی جانچ پڑتال کرتے رہیں کہ ان میں کوئی ایسی خرابی نہ پیدا ہونے پائے جو قوموں کی تباہی کا موجب بنا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی چند ایک بنیادی اصولوں کو بھی یاد رکھیں۔ مثلاً :-

اصولِ حیات

(۱) تمہیں یہ مقام جسے استخلاف فی الارض کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے، ایمان اور عمل کے نتیجہ میں ملا ہے (۲۴/۵۵)۔ ایمان کے معنی ہیں مستقل اقدارِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم۔ اور عمل کے معنی ہیں ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی کی تشکیل۔ جب تک تمہاری یہ کیفیت رہے گی تمہارا بلند و بالا مقام قائم و دائم رہے گا۔

(۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) جو مقام کسی قوم کو حاصل ہوتا ہے وہ اس سے کبھی نہیں چھنتا جب تک وہ اپنے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرلے جو اسے اس مقام کا اہل نہ رہنے دے۔ نفسیاتی تبدیلی تعلیم و تربیت سے ہوتی ہے اس لئے اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت اس انداز سے کرنا کہ ان میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر رونما نہ ہونے پائے جو انہیں تباہی کی طرف لے جائے۔

(۳) اپنے ہاں معاشی نظام اس قسم کا رائج رکھنا جس میں ذرائع پیداوار اور مال و دولت ہر ایک کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کیلئے کھلے رہیں۔ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اگر تم نے اس قسم کے نظام سے اعراض برتا تو یاد رکھو تمہاری جگہ کوئی اور قوم آجائیگی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی، تم سے بہتر ہوگی۔ (۴۷/۳۸)

(۴) جب کسی قوم میں ظلم عام ہو جائے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ (۲۱/۱۱) ظلم کا مفہوم تو بڑا وسیع ہے لیکن اسکے بنیادی معنی یہ ہیں کہ جس شے یا جس شخص کو جس جگہ ہونا چاہیئے اسے وہاں نہ رکھنا۔ ظلم سے قوموں کی جڑ اس طرح کٹ جاتی ہے کہ خلقِ خدا ان کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ (۶/۴۵)

(۵) اور سب سے آخر یہ کہ دنیا میں حق اور باطل کی کشمکش ہر وقت جاری رہے گی۔ تم باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلسل مصروفِ جدوجہد رہو اور اس مقصد کے لئے تمہیں جان تک بھی دینی پڑے تو بلا تامل و توقف دیدو۔ اگر دنیاوی جاذبیتوں نے تمہارا راستہ روک لیا اور تم نے جہاد سے گریز کیا تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا۔ (۹/۳۹) تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

یہ تھے وہ اصول و ضوابط جو خدا نے اس قوم کو دیئے جس نے خدا کے نام پر مملکت قائم کی۔

اور وہاں سے آگے بڑھ کر آپ اس قوم کی طرف آجائیے جس نے تیرہ سو سال کے بعد ایک بار پھر خدا کے نام پر قائم کرنے کے لئے ایک مملکت

ملتِ پاکستانیہ

کا مطالبہ کیا اور اسے وہ مملکت عطا کر دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اس مملکت اور اسکی حامل قوم کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنا اس قوم کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں جسے اس حقیقت پر ایمان ہو کہ سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ قوموں کے عروج و زوال سے متعلق قوانینِ خداوندی اٹل ہیں۔ انہی کے مطابق اقوامِ سابقہ کے مستقبل کا فیصلہ ہوا تھا انہی کی رو سے ہمارے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ اس لئے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ اقوامِ سابقہ کے سامنے تاریخی شواہد تمہارے سامنے ہیں۔ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۳/۱۳۶) تم دنیا میں چلو پھرو اور

نگہِ بصیرت سے دیکھو کہ جن اقوام نے ان قوانین کو جھٹلایا تھا ان کا انجام کیا ہوا۔ اور اس کے بعد کہا کہ یہ حقیقت کسی خاص قوم، خاص زمانے یا خاص مقام تک محدود نہیں۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ یہ تو عالمگیر انسانیت کے لئے واضح حقیقت ہے وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (۳/۱۳۸)، دنیا کی جو قوم بھی چاہے کہ وہ ان خطرات سے محفوظ رہے جن سے اقوام سابقہ دوچار ہو کر تباہ ہوئی تھیں تو وہ ان کے احوال و کوائف سے عبرت اور ان قوانین سے راہ نمائی حاصل کرے۔

لہٰذا ہمیں دیکھنا ... یہ ہے کہ وہ کونسی خرابیاں تھیں جو اقوام سابقہ کی تباہی کا موجب بنیں۔ اور پھر اس کا جائزہ لینا کہ وہ خرابیاں ہمارے ہاں تو نہیں پیدا ہو گئیں۔ یہ خرابیاں "قوم" پہ قوم گنائی جا چکی ہیں لیکن چونکہ ہم کافی لمبی مسافت طے کر آئے ہیں جس کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اس سفر کے بعض سنگِ میل ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہوں اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان خرابیوں کی مختصر سی فہرست ایک بار پھر سامنے لے آئی جائے تاکہ اس سے تجدید یادداشت ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم حقیقت کو اچھی طرح سامنے رکھئے کہ بنیادی جرم تو دراصل ایک ہی ہے جس سے قوموں کی تباہی ہوتی ہے یعنی وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار سے بے اعتنائی برتنا اور معاشرہ کا نظام اپنے خود ساختہ قوانین و ضوابط کے مطابق متشکل کرنا۔ باقی جرائم اسی اصل کی مختلف شاخیں ہیں لیکن چونکہ وہ جرائم نمایاں اور محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اس لئے انکے تذکرہ سے بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اب ان جرائم کی فہرست ملاحظہ فرمایئے جن کی وجہ سے اقوام سابقہ تباہ ہوئی تھیں۔

تباہ کن جرائم کی فہرست

(۱) جب کسی معاشرہ میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں، عزت کا معیار دولت قرار پا جائے اور محنت اور دستکاری سے روٹی کمانیوالوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے جیسا کہ قوم نوح کے ساتھ ہوا۔

(۲) جب قومیت کا معیار، ایمان یا نظریۂ حیات کے اشتراک کے بجائے رنگ، نسل، وطن کا اشتراک قرار پا جائے تو اس کا نتیجہ بھی تباہی ہوتا ہے، یہ حقیقت بھی حضرت نوح ؑ کے تذکرہ سے سامنے آتی ہے۔

(۳) جو قوم جور و جبر سے حکومت کرے اور دوسروں کی محنت کی کمائی کا استحصال (EXPLOITATION) ان کا شعار ہو وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی خواہ وہ تمدن و تہذیب کی کتنی بلندیوں تک کیوں نہ پہنچ چکی ہو اور علوم و سائنس میں کتنی ہی آگے کیوں نہ بڑھ گئی ہو۔ قوم عاد کی سرگزشت سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

(۴) جس معاشی نظام میں ذرائع پیداوار ـــ یعنی زمین اور اسکے متعلقات ـــ پر ذاتی ملکیت جائز قرار دیدی جائے اور اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کیلئے کھلی نہ رہنے دی جائے، اس نظام اور اسکی حامل قوم کو دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ قوم ثمود کی سرگزشت اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

(۵) جس قوم کا کاروبار سرمایہ داری کے اصول پر قائم ہو یعنی اس میں سرمایہ دار طبقہ کو کھلی چھٹی ہو کہ وہ محنت کشوں کو جو جی میں آئے دے اور صارفین (CONSUMERS) سے جتنا جی چاہے وصول کر لے، وہ ماپ اور تول کے پیمانے اپنی منفعت اور مصلحت کے مطابق رکھے اور اس پر اس سے بازپرس کرنیوالا کوئی نہ ہو، وہ قوم تباہ ہو کر رہتی ہے۔ یہ حقیقت قوم شعیب کی سرگزشت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

(۶) اور اسی قوم کی سرگزشت سے یہ حقیقت بھی کہ جب مذہب کا دائرہ پوجا پاٹ تک محدود کر دیا جائے اور اسکی ہر ایک کو آزادی ہو لیکن کاروباری معاملات میں اسے دخل نہ دینے دیا جائے یعنی جہاں نظام سیکولر ہو، وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔

(۷) اور قوم لوط کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم میں جنسی ضوابط اور پابندیوں سے بے اعتنائی برت کر فحاشی اور جنسی بدنہادی کو عام ہونے دیا جائے اس قوم کی کشتی بحرِ میت میں ڈوب جاتی ہے۔

(۸) قوم فرعون کے انجام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس قوم کی سیاست میں بدانداز ملوکانہ پیدا ہو جائیں وہ قوم غرق ہو جاتی ہے۔ انداز ملوکانہ کی ابھری ہوئی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں حکمرانی قانون کی نہیں ہوتی، ایک فرد یا افراد کے مجموعے کے فیصلوں کی ہوتی ہے۔ اس میں قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا

جاتا ہے اور پھر پارٹیوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر انکی اجتماعی قوت کو کمزور سے کمزور تر کیا جاتا ہے۔ ان میں ان لوگوں کو آگے بڑھایا جاتا ہے جن میں جوہرِ مردانگی نہ ہو اس لئے وہ ہمیشہ جماعتِ حاکمہ کے تابع فرمان ہیں جن لوگوں میں ذرہ برابر بھی غیرت و حمیت کے آثار نمودار ہوں انہیں کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔

نیز اس نظام میں رزق کے سرچشمے قوم کی تحویل میں رہنے کے بجائے جماعتِ حاکمہ کی ذاتی ملکیت متصور ہوتے ہیں اور اس طرح یہ حکمران طبقہ قوم کا آب و دانہ اپنی انگلیوں پر نچاتا رہتا ہے۔ اس مقصد کیلئے یہ طبقہ مذہبی پیشواؤں کو اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اپنے حریفوں کو ان کے سپرد کر دیتا ہے تاکہ وہ عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے انہیں ختم کر کے رکھ دے۔

(۹) قوم بنی اسرائیل گویا ان تمام جرائم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ ان کا نظامِ زندگی، ربوٰا اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پہ استوار تھا۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ ان کا نظام کیپٹل ازم اور تھیاکریسی کے ستونوں پر قائم تھا۔ سرمایہ داروں کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ جس طریقے سے چاہیں دولت سمیٹتے چلے جائیں، بشرطیکہ وہ صدقے، خیرات کے کاموں میں چندہ دیدیا کریں اور مذہبی پیشواؤں کے اقتدار کو قائم رکھیں۔ ان کے لیڈروں کی حالت تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ لوگ ان کی جھوٹی تعریفیں کرتے رہیں اور وہ کرکے کچھ نہ دکھائیں بلکہ محض بیان بازی کے زور پر پاپولیرٹی (POPULARITY) حاصل کرتے رہیں۔ جہاں تک مذہبی پیشوائیوں کا تعلق ہے، مذہب ان کا پیشہ تھا اور دین فروشی ان کا ذریعہ معاش۔ وہ اپنے جی سے شریعت کے مسائل گھڑتے اور انہیں خدا کا دین کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ قوم مختلف مذہبی فرقوں میں بٹی ہوئی تھی اور ان فرقوں کے امام ایک دوسرے پر کفر کے فتوے عاید کر کے عوام کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ حکام کے ساتھ ان کی سازباز تھی اور جس شخص کو دیکھتے کہ وہ ان کی مفاد پرستیوں کے راستے میں حائل ہے اس پہ کفر و الحاد کا فتویٰ صادر کر کے اس کی موت کے احکام صادر کرا لیتے۔ یہ تھے اس قوم کے کبیرہ جرائم جن کا نتیجہ ان کی ایسی تباہی تھی جو دنیا میں ضرب المثل بن کر رہ گئی۔ اس قوم کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم کے معاشرہ میں یہ خرابیاں پیدا ہو جائیں وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

(۱۰)

باز بخویشتن نگر

یہ ہے ان جرائم کی فہرست جن کی وجہ سے اقوامِ سابقہ اپنے اپنے وقت میں تباہ و برباد ہو گئیں۔ ان کی سرگزشتوں کو قرآن کریم نے اسلئے بیان کیا ہے کہ ان کی روشنی میں ہم خود فیصلہ کریں کہ ہمارا مستقبل کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقائق اس قدر واضح اور یہ معیار اس قدر نکھرا ہوا ہے کہ اس کی موجودگی میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا، کسی کمیشن بٹھانے کی ضرورت نہیں۔ خدا کے قوانین اٹل ہیں اور ہماری حالت بالکل بے نقاب۔ آپ سوچئے کہ قوموں کو تباہ کرنے والے جرائم کی جو فہرست قرآن کریم نے پیش کی ہے، ان میں کوئی ایک جرم بھی ایسا ہے جو ہمارے معاشرہ میں عام نہ ہو چکا ہو اور اس کے بعد سوچئے کہ اگر ہماری حالت یہی ہے اور ہم اپنے موجودہ نظام کو نہ بدلیں تو دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں تباہ ہونے سے بچا سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے بہی خواہانِ ملت قوم کو تباہی سے بچانے کے لئے مختلف طریقے سوچ رہے ہیں لیکن معاف فرمائیے اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ ان سب کی نگاہ علاماتِ مرض پر ہے، علتِ مرض پر نہیں۔ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ اگر ہم زیادہ سے زیادہ عسکری قوت حاصل کرلیں تو پھر ہم ہر طرح سے محفوظ اور مامون رہ سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عسکری قوت، قوموں کی حفاظت اور بقا کے لئے لاینفک ہے اور اسکے فراہم کرنے کی قرآن بڑی تاکید کرتا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عسکری قوت کو اگر حدودِ خداوندی کے تابع نہ رکھا جائے تو خود وہی قوت قوم کو تباہ کرنے کا موجب بن جایا کرتی ہے۔ دیکھئے وہ نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کیسے واشگاف الفاظ میں بتاتا ہے کہ ان لوگوں کو اپنی قوت پر بڑا ناز ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو جی میں آئے کریں، ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کہہ کر ان سے کہہ دو کہ ذرا تاریخی شواہد پر نگاہ ڈالو۔ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ۔ (۴۷/۱۳) کتنی قومیں ایسی تھیں جنہیں تم سے کہیں زیادہ قوت

حاصل تھی لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کی قوت ان کے کسی کام نہ آئی، وہ تباہ و برباد ہو گئیں اور کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔

بعض زور دیتے ہیں کہ یہ دور سائنسی ایجادات کا ہے اسلئے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی پر زیادہ سے زیادہ زور دینا چاہیئے۔ یہ دور سائنٹیفک ترقیوں کا ہو یا نہ ہو، قرآن کریم نے تو آج سے چودہ سو سال پہلے کہدیا تھا کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا، وجۂ امتیازِ آدمیت ہے۔ اسلئے سائنٹیفک ترقیاں ہمارا فریضہ ہے لیکن اگر سائنٹیفک ایجادات کو مستقل اقدار کے سوا حل کا پابند نہ کیا جائے تو

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے ۔۔۔ عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اس نے کہا ہے کہ تم اقوامِ گزشتہ کے تاریخی نوشتوں کو دیکھو تمہیں ان میں ایسی ایسی قومیں نظر آئیں گی جنہیں سماعت، بصارت اور ذہنِ رسا کی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں حاصل تھیں لیکن فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶) لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کے علم و ہنر کی صلاحیتیں ان کے کسی کام نہ آئیں اور وہ انہیں اس تباہی سے ذرا بھی محفوظ نہ رکھ سکیں جس کے متعلق وہ کبھی (SERIOUSLY) سوچا نہیں کرتے تھے وہ ان قوانین و اقدار کو مذاق سمجھتے تھے۔ لیکن فیصلہ کن حقیقتیں وہی ثابت ہوئیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے خود مغربی محققین بھی اپنی مدت العمر کی تحقیق و تفتیش کے بعد تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ ..... شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) کا مصنف بریفالٹ لکھتا ہے :-

> اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہو گئی ہے۔ نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کے توڑنے کے قابل ہو جائے اور علوم و فنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہرِ ذاتی میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔ قوت، تہذیب، کلچر سب بے معنی ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ماپی جا سکتی ہے۔ اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ (P.259)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل مسئلہ روٹی کا ہے۔ اگر اسے حل کر لیا جائے تو تمام خرابیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ قرآن کریم روٹی کے مسئلہ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک بھوک خدا کا عذاب ہے اور رزق کی فراوانیاں اس کی نعمتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ اگر رزق کی فراوانیوں کو مستقل اقدار کے تابع نہ رکھا جائے تو وہی فراوانیاں معاشرہ کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔ سورۂ قصص میں ہے۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۲۸/۵۸) کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنہیں رزق کی فراوانیاں حاصل تھیں لیکن اسکے باوجود وہ تباہ ہو گئیں۔ یہ ہیں ان کے اُجڑے ہوئے کاشانے جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس طرح چراغِ سحری بجھنے سے پہلے اور تیزی سے جگمگاتا ہے اسی طرح جب کسی قوم کے ہلاکت کے دن قریب آ جاتے ہیں تو اُن کے ہاں دولت سیلاب کی طرح اُمڈ کر آ جاتی ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۶/۴۴) ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم ان اقدار کو فراموش کر دیتی ہے جن کی انہیں اکثر یاد دہانی کرائی جاتی رہی ہے تو ان پر سامانِ زیست کے پھاٹک کھل جاتے ہیں اور جب وہ دولت و ثروت کی اس قدر فراوانیوں کی رَو میں بہہ جاتے ہیں تو ان پر اچانک تباہی آ جاتی ہے۔ ایسی تباہی کہ انہیں بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لہٰذا، قرآن کریم کی رُو سے تنہا روٹی کے مسئلہ کا حل بھی کسی قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ قوموں کے لئے تباہی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے وہ بنیادی اصول جس سے ہر آسمانی پیامبرِ انقلاب نے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ یعنی اُعْبُدُوا اللّٰهَ جس سے مراد یہ ہے کہ زندگی

کے ہر گوشے میں اقدارِ خداوندی کی اطاعت کیجائے جو اب قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جب ملی ہیئتِ اجتماعیہ یعنی نظامِ معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو وہ قوم ہر لحاظ سے اَعْلَوْن کے مقام پر پہنچ جاتی ہے یعنی دنیا کی کوئی قوم اس کی ہمدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر وہ ان اقدار سے بے اعتنائی برتتی ہے تو سیاسی غلبہ، تسلط، عسکری قوت، حشمت یا معاشی فراوانی و فراخی اسے تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ ایک بار پھر پرویز کے الفاظ سنئیے۔ وہ کہتا ہے

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس نظام کو کیسے ہی تدبّر اور دانشمندی سے کیوں چلایا جائے۔ وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے (۱۵۹ : ۲۴۳)

یہ ہے قرآن کریم کا آخری فیصلہ جس کی تائید خود مغرب کے دیدہ ور بھی کر رہے ہیں۔ ہم نے قرآن کریم کی روشنی میں ان اقوام کی سرگزشتوں کا مطالعہ کر لیا ہے جو اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ ہو گئیں اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ ان اقوام میں اگر وہ کبائر الاثم ایک ایک دو دو کر کے ابھرتے تھے تو ہم ۔۔۔ میں وہ سب کے سب یکجا ہو چکے ہیں اور دن بدن زیادہ سے زیادہ پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے متعلق خدا کے قانونِ مکافات کا فیصلہ واضح ہے۔

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں

اس میں شبہ نہیں کہ یہ صورتِ حالات بڑی مایوس کن ہے لیکن ابھی امید کی کچھ کرنیں باقی ہیں۔ قرآن کریم ہی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ غلط نظام کے تباہ کن نتائج آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں اور ان کی آخری شکل وہ ہوتی ہے جب تباہی محسوس طور پر اس قوم کے سامنے آ جاتی ہے۔ اگر وہ قوم اس سے پہلے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لے تو اس کے بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن جب تباہی محسوس شکل میں سامنے آ جائے تو پھر وہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ دیکھئے، سورۃ الانبیاء میں اس حقیقت کو کیسے محاکاتی انداز میں (GRAPHICALLY) بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ۔ کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جو اپنے اس نظام کی وجہ سے جو ظلم اور ناانصافی پر مبنی تھا، تباہ ہو گئیں۔ ان کی حالت یہ تھی کہ انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن مآل سے آگاہ کیا گیا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ہم جس روش پر چل رہے ہیں اس سے ہمیں فروغ حاصل ہو رہا ہے اس لئے اس کا نتیجہ تباہی کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس کے نتائج غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر مرتب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جب میعاد ختم ہو گئی فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ اور ان کی تباہی محسوس شکل میں ان کے سامنے آ گئی تو وہ لگے بھاگنے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکار کر کہا لَا تَرْكُضُوا۔ بھاگو نہیں۔ تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ۔ چلو اپنے محلات کی طرف اور اس سامانِ تعیش کی طرف جو تم نے اس طرح فراہم کر رکھا تھا۔ چلو واپس تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے اتنا مال و دولت کہاں سے لیا تھا۔ وہ مظلوم کون سے تھے جن کے خون کی رنگینی تمہارے محلات کیلئے وجہ آرائش و زیبائش بنی تھی۔ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ۔ چنانچہ جب انہیں گرفتار کر کے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ہم نے یہ سب کچھ ظلم و استحصال سے حاصل کیا تھا۔ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ (۲۱/۱۵) وہ یہ دہائی مچاتے رہے لیکن اس وقت اس پکار اور فریاد نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا اور وہ قوم ایسی ہو گئی جیسے کوئی کٹا ہوا کھیت ہو یا بجھا ہوا شعلہ۔

لہٰذا جس قلبِ حساس میں پاکستان کا درد ہے اور اس قوم کو تباہی سے بچانے کی تمنا اس میں موجزن، اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ معاشرہ کو قرآنی اقدار کے تابع لے آئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ یہ مملکت ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو جائے گی بلکہ عزت و ثروت کے اس مقامِ بلند پر پہنچ جائیگی جہاں سے انسان اپنے مقدر کے ستاروں کو جھک کر دیکھا کرتا ہے۔ لیکن اگر ان سے اعراض برتا گیا تو ہماری تباہی یقینی ہے یہی خدا کی سنتِ مستمرہ ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔ اور سنت اللہ کبھی بدلا نہیں کرتی۔ یاد رکھیے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

(پرویز ۔ ۱۹۷۱ء)

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ

محشرستانِ فلسطین

(نوشتہ ۱۹۶۷ء)

پس منظر

(اسرائیلی حکومت مئی ۱۹۴۸ء میں وجود میں آئی تھی اور ہم نے جون ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جس میں اس کش مکش کے پس منظر کو پوری صراحت کے ساتھ واضح کیا تھا۔ حالات آگے بڑھتے گئے تو ہم نے اپنی اشاعت بابت فروری ۱۹۶۷ء میں اسے دھرایا۔ اس کے بعد بھی قطعاً وقتاً اس المیہ جانگداز و جگرسوز کے متعلق لکھتے رہے۔ اب جو اس مسئلہ نے خاص اہمیت حاصل کی ہے تو ہم سے کہا جا رہا ہے کہ اس قضیۂ ماضی کو سامنے لایا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس مفسدہ انگیزی اور خونریزی کی اصل کیا ہے۔ اس بنا پر ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کی ابتدا اس تشریحی مقالہ سے کی جائے جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا اور جو بڑا معلومات افزا تھا۔ اس ماضی کی داستان سے حال کی حشر انگیزی کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی)۔

(۰)

اہلِ فلسطین، خواہ وہ کسی نسل سے متعلق کیوں نہ رہے ہوں، آغازِ تاریخ سے ہی جنگوں سے دوچار رہے ہیں۔ انسانی تاریخ کوئی زیادہ طویل نہیں، بمشکل چھ سات ہزار سال کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ تاریخ کی روشنی وقت کے اندھیرے کو اور روشن کر سکے تو فلسطین جنگ و پیکار میں ہی اُلجھا دکھائی دے گا۔ جغرافیہ نے اس ملک کو، کہ جس کا رقبہ بمشکل پنجاب کے چار اور سندھ کے دو اضلاع کے برابر ہوگا، کچھ ایسا مقام بخشا ہے کہ یہ حقیر سا ملک کبھی امن و اطمینان سے نہ رہ سکا۔ نقشۂ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ روشن ہو جائے گا کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

بین الاقوامی جنگاہ

منضبط تاریخ کے آغاز سے ہی فلسطین معلوم دنیا کا مرکز تھا۔ اس کے مشرق میں ایشیا تھا، مغرب میں یورپ، شمال میں پھر یورپ اور ایشیا، جنوب میں افریقہ۔ یہ ساری کی ساری معلوم دنیا تھی۔ امریکہ، آسٹریلیا اور شمالی ساحل کے علاوہ سارا

افریقہ غیر مساحت شدہ اور غیر معلوم تھا۔ شمالی اور جنوبی امریکاؤں اور آسٹریلیا ایسے وسیع و عریض ارضی حصص کی موجودگی کا گمان تک بھی نہ تھا۔ نقشہ پر یورپ تھا، اور وہ بھی جنوبی اور مشرقی، شمالی افریقہ مشمولہ مصر اور ایشیا۔ اس معلوم دنیا کے عین وسط میں ایک معمولی حصہ زمین، انگلستان کے علاقہ ویلز کے برابر فلسطین۔ مظلوم دنیا میں قومیں اُبھرتی اور مٹتی رہیں۔ چین، وادیٔ سندھ، اسیریا، بابل، مصر، فارس، یونان، روما! ان اقوام کے عروج و زوال کے لئے باہمی تصادم ناگزیر تھا۔ ان بین الاقوامی معرکوں کے طوفان اس حقیر سے زمینی ٹکڑے کو بے دردی سے روندڈالتے رہے۔ اس کے حسیات و مطالبات دھرے کے دھرے رہ جاتے اور اس کے باشندے کچل دئے جاتے فلسطین کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا کہ وہ اس کا حلیف ہو یا اُس کا حریف، وہ کس کی مدد کرے اور کس سے استمداد۔ اس کا فیصلہ اور انتخاب کچھ بھی ہو، نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

امن کے زمانہ میں فلسطین، بین الاقوامی، تجارتی قافلوں کی گزرگاہ تھا۔ اور جنگ کے زمانہ میں عساکر و جیوش کی آماجگاہ۔ فلسطین بری اور بحری شاہراہوں پر تھا۔ یورپ۔ ایشیا اور افریقہ فلسطین کے ذریعہ باہمی تجارت کرتے تھے۔ امن کی حالت میں فلسطین فارغ البال رہتا اور جنگ کے دوران میں وہ تباہ ہو جاتا۔ اس کی قومی آزادی و خود مختاری ناقابلِ حصول ہی رہی۔ ایسے مواقع پر کہ متحارب فریق برابر قوت کے مالک ہوتے تھے فلسطین کسی ایک طرف ہو کر پانسہ پلٹ دیتا تھا۔ اس وقت اہلِ فلسطین کی حقیر امداد بھی متعلقہ فریق کا پلڑا بھاری کر دیتی۔ لیکن یہ اہمیت خطرناک تھی۔ وہ حریف یا حلیف بن کر آسان جنگاہ بن جاتا رہا۔

آلِ اسرائیل

حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (مردِ خدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی، اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (JUDA) تھا۔ یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ فلسطین کے علاقہ موسومہ (JUDA) میں سلطنت کرتا تھا۔ اسی نسبت سے انہیں یہودی کہا جانے لگا اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل..... آہستہ آہستہ یہ تفریق بھی جاتی رہی۔ چنانچہ اب بنی اسرائیل اور یہودی کا ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنے والد بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بلا لیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کی وجہ سے ان کی مصر میں بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے۔ یہیں بڑھے، پھولے، پھلے۔ جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا، اس عرصہ میں عظیم الشان قوم بن گیا۔ فرعونِ مصر ان کی بڑھتی ہوئی قوت و کثرت سے خائف ہوا کہ مبادا وہ اس کے دشمنوں سے مل کر کوئی سازش برپا کر دیں۔ اس لئے اس نے انہیں کچلنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا کہ "بنی اسرائیل کی قوت کی روک تھام کے لئے ان کے بیٹوں کو ہلاک کر دیا جائے اور بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں"۔ یعنی ان میں سے ایسے لوگوں کو جن میں جوہرِ مردانگی کی نمود ہو، کچل دیا

جائے، اور زنانہ صفت لوگوں کو آگے بڑھایا جائے۔

حضرت موسیٰؑ، کہ آلِ اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اسی عالم میں مصر کے دارالسلطنت میں پیدا ہوئے۔ مشیتِ ایزدی نے آلِ اسرائیل کے اس فرزند کی پرورش کا سامان شاہی محلات میں کر دیا اور اس کے بعد طور کی وادیوں میں آزاد تربیت کا انتظام۔ وہاں سے لوٹے، کہ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دی جائے۔ یہودیوں کی اپنی روایات (عہد نامہ عتیق) کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے بعد یوشع کی قیادت میں بنی اسرائیل نے فلسطین کو بزورِ شمشیر فتح کیا اور قدیم باشندوں کو ملک بدر کر دیا یا ان کا خاتمہ کر دیا۔ جدید مؤرخین اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ قدیم باشندے بالکلیہ نیست و نابود ہو گئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی مکمل طور پر فتح نہیں ہو سکے۔ بلکہ مفتوحہ علاقہ میں آباد رہے اور بنی اسرائیل سے ازدواجی تعلقات قائم کر لئے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی کتاب (THE OUTLINE OF HISTORY) میں لکھا ہے:-

> یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ سرزمین (THE PROMISED LAND) کبھی بھی مکمل طور پر عبرانیوں کے قبضہ میں رہی ہے۔ انجیل کی متفرق کتابوں میں باختلافِ واقعات تاریخ کو دہرایا گیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ (PHILISTINES) جنوب کی زرخیز زمین پر قابض رہے اور شمال میں کنعانی اور فونیشین اسرائیلیوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

اسرائیلی، شبانی اور زرعی زندگی کے عادی تھے، مگر ان میں سپاہی بھی تھے۔ مفتوح (یا ہنوز غیر مفتوح) پر رحم کرنا، ان کے نزدیک یہودہ کے خلاف گناہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے پیشرو مالکانِ زمین کو ختم نہ کر دینا ادائے فرض میں ناکامی کے مرادف سمجھتے تھے۔ یہودیوں کی موجودہ خصائل —— شہروں میں بسنا، مالیات و تجارت میں مہارت وغیرہ —— ان کے اسرائیلی اسلاف کی خصائل ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی خونریزی کی تفسیر ہے۔ بعد میں وہ کاشتکار اور زراعت پیشہ رہے نہ کہ مدنی۔ حضرت سلیمانؑ کے تزک و احتشام کے باوجود عہد نامۂ عتیق کی داستان، مکانات اور محلات کے بجائے گیہوں، انگور، زیتون، بھیڑوں اور بیلوں کی داستان ہے۔ خدا کے لئے ان کے ہاں عزیز ترین نام "شبان" (گڈریا) ہے۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ، آلِ اسرائیل کے جلیل القدر بادشاہ تھے اور پیغمبر بھی۔ حضرت داؤدؑ نے پہلی بار گیارھویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور حضرت سلیمانؑ نے دسویں صدی میں بیت المقدس کے پہلے ہیکل کی تعمیر کرائی۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کے اوجِ کمال کا زمانہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ان کی شوکت و ثروت انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد انحطاط کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد بارہ اسرائیلی قبائل میں سے دس نے فلسطین کے شمالی حصہ میں "سلطنت اسرائیل" کو قائم کیا۔ باقی دو یعنی جوڈاہ اور بن یامین کے قبائل بدستور

جنوب میں تختِ داؤد کے وفادار رہے۔

تباہی کی داستان

یوں تو یہود کی تباہی کی داستان کی ہر کڑی عبرت انگیز ہے لیکن ان پر دو مرتبہ ایسی ہلاکت آفریں بربادی کی لعنت طاری ہوئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی تھی۔ قرآن نے ان ہر دو مواقع کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر بربادی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی، بلا جرم سزا نہیں تھی۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ
وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا۔ (۱۷/۴)

اور (دیکھو) ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دے دی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔"

تورات میں بھی بنی اسرائیل کی ان دو بڑی تباہیوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ کوئی ۷۲۱ ق۔م میں شمالی فلسطینی حکومت پر اشوریوں نے قبضہ کر لیا تھا اور باشندوں کو قید کر کے لے گئے تھے، تاریخ ان کے انجام کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ اس حادثہ کے کوئی ایک سو سال بعد بابل کے شاہ بخت نصر نے "جنوبی حکومت" کو تہ و بالا کر دیا۔ یروشلم کی، کہ یہودیوں کا دینی اور سیاسی مرکز تھا، اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ قتل و غارت گری سلب و نہب کا ایسا جاں گداز مرقع تھا جو تاریخِ عالم میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف بنی اسرائیل کی سلطنت تباہ ہوئی، بلکہ ان کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی اور غلامی و محکومی، ہلاکت و بربادی کی بڑی سے بڑی مصیبتیں جو کسی قوم پر آ سکتی ہیں سب یکجا ہو گئیں۔ بخت نصر نے یروشلم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتلِ عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ سانحہ ایسا المناک اور دل سوز تھا کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں یہودیوں کے انبیاءؑ ان کی اس زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ اسارت کا یہ زمانہ شاہِ فارس کے ہاتھوں ختم ہوا، جب ساٹھ سال کے بعد سائرس نے دریائے فرات اور بحرِ روم کا درمیانی علاقہ فتح کر لیا اور یہودیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی۔ شاہ شاہانِ فارس نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی از سرِ نو تعمیر کی بھی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵۳۷ سے ۵۱۵ ق۔م کے دوران ہیکل پھر تعمیر ہو گیا اور مردہ یہودی قوم نے پھر زندگی حاصل کی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی طرزِ زندگی کی طرف لوٹ آئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ فارس کے زیرِ اقتدار یہودیوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی، سکندر نے ۳۳۲ ق۔م میں اس پر ضرب کاری لگائی اور فلسطین کی آزادی کا مادہ مسلوب کر لی۔ ۳۲۰ ق۔م میں بطلیموس (PTOLMY) نے مصر کے راستے حملہ کیا۔ اور یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ یونانیوں (مصری بطلیموسوں) نے یہودیوں پر خوب مظالم کئے۔

حتیٰ کہ ۶۶ء ق م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہو گئی جن کا ذکر صحف یہود میں اور جن کے آثار ان کی پیشانیوں میں جھلک رہے تھے۔ پاپی (رومی) آگے بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں تقریباً بارہ ہزار یہودی تباہ ہو گئے۔ ۵۱ء ق م کے قریب ایک اور یورش میں تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے۔ اور ڈھور ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔

فطرت کی طرف سے انہیں باز آفرینی کا ایک اور موقع دیا گیا اور ان حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے لیکن یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد ان کی آخری بربادی کا وقت آ گیا۔ رومیوں نے ۷۰ء میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس بدبخت قوم پر ابدی ہلاکت کی مہر ثبت کر دی۔ اس کے بعد یہ قوم دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں ذلیل و خوار رہی۔ "قبل مسیح"، بعد مسیح میں بدل گیا۔ لیکن یہودیوں کے مصائب میں کمی نہ ہوئی..... ۱۳۵ء میں شاہ ہیڈرین (HADRIAN) نے یروشلم پر قبضہ کیا اور اسے مکمل طور پر غارت کر دیا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال کر چار دانگ عالم بکھیر دیا۔

آئندہ سال یروشلم میں

فلسطین سے نکل کر یہودی جس جس ملک میں گئے وہیں آباد ہو گئے وہیں کے باشندے بن گئے۔ فلسطین میں ان کی تعداد بمنزلہ صفر کے رہی۔ ان میں سے بعض البتہ فلسطین کے خواب ضرور دیکھتے رہے اور وقتاً فوقتاً، قطرہ قطرہ فرداً فرداً فلسطین میں واپس آتے گئے۔ ان کی مراجعت کی ایک حد تک وجہ یادِ وطن تھی اور ایک حد تک یہ مذہبی آرزو اور عقیدہ کہ فلسطین خدائے یہوہ (JEHORAH) نے ان کے لئے مقدر کر دیا ہے۔ "دشمن" کی فتوحات اور "اپنی" شکستیں "تقدیر" کے اس لکھے کو مٹا نہیں سکتیں۔ یہ آرزوئے "وطن" مذہبی عقیدہ سے مذہبی رسم میں بدل گئی۔ چنانچہ ہر سال (PASSOVER) کی ضیافت میں یہ الفاظ دہرائے جاتے رہے کہ "آئندہ سال یروشلم میں"۔

یہودی تاریخ ساز نہیں بلکہ تاریخ کی ساختہ ہیں۔ انہوں نے تاریخ کو بنایا نہیں بلکہ وہ تاریخ سے بنے ہیں۔ جب صحراؤں کی خاک چھاننے کے بعد ارضِ مقدس و موعودہ میں داخل ہوئے ہیں تو تاریخ کے قابلِ ذکر ادوار میں ان کی آس پاس کی قوموں کے ہاتھوں لکھے جا چکے تھے۔ انہوں نے نہ کلچر کو ترقی دی، نہ تہذیب و تمدن میں کچھ خاص اضافہ کیا۔ ان کی حکومت اور تشخص قومی کا دور مختصر اور ناقابلِ رشک تھا۔ جب بھی ان کے پاس کچھ دولت جمع ہو جاتی، اور فراغت کے آثار نمایاں ہونے لگتے، کوئی نہ کوئی غارت گر آ پہنچتا اور ان کو تباہ و برباد کر کے چلا جاتا۔ بخت نصر کے ہاتھوں جب ان کی تباہی ہوئی تو پھر تاریخ کا رہا سہا رشتہ بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ شاہ فارس سائرس نے ہر چند انہیں فلسطین واپس آنے کی اجازت دے دی لیکن چونکہ اسارت کا زمانہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا، اس لئے کم تعداد میں یہودی واپس آئے اور جو آئے وہ بھی اصل یہودی نہیں تھے۔ ان کا تشخص مٹ چکا تھا اور ذلت و مسکنت کی لعنت ان پر مسلط ہو چکی تھی۔

زمان و مکان کے پاس یہودیوں کے ظلم و استبداد کے سوا کچھ نہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں وہ دیگر

اقوام کا تختۂ مشق بنے رہے۔ جب عیسائیت کا دور دورہ شروع ہوا تو اس حقیقت کے باوجود کہ حضرت مسیحؑ یہودی تھے اور ان کے اوّلین حواری بھی یہودی تھے، ان کو دشمنانِ مسیحیت سمجھ کر مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ عیسائی سلطنت میں یہودیوں کے لئے چنگڑ خانے بنائے گئے۔ معاش کی راہیں ان کے لئے مسدود کر دی گئیں اور ان کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ان کے لئے سود خواری کے سوا کوئی راہِ معاش نہیں تھی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انہیں طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ اور بے دردی اور سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پوپ پیئس پنجم کے ایک حکم سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں پرانے کپڑے بیچنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ یہ قومی سزا اس کی ایک جرم کی پاداش میں تھی کہ وہ یہودی تھے۔

انقلابِ فرانس نے عوام کا نظری مرتبہ بلند کیا۔ اور خیالات و نظریات میں جو رواداری اور کشادہ نگہی پیدا کی وہ یہودیوں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۷۸۹ء یہودیانِ یورپ کے لئے ایک نئی صبح کا پیغام تھا۔ آئندہ سو سال میں روس کے سوا ہر جگہ ان پر سے پابندیاں ہٹا دی گئیں۔ اب وہ معزز شہری بن سکتے تھے، گاڑیوں میں سفر کر سکتے تھے، زمین کے مالک بن سکتے تھے۔ اور دیگر آزاد شہریوں کی طرح آزادانہ کام کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا ملک ہو، جہاں ان کے خلاف کسی قسم کی نفرت نہ پائی جاتی ہو۔ کم یا زیادہ نفرت ضرور پائی جاتی ہے۔ ان مراعات کا ظاہر خواہ اثر ہوا اور یہودی جہاں کہیں آباد تھے، وہیں کے مستقل باشندے بن گئے۔ وہ کوئی دو ہزار سال سے غریب الدیار اور بے وطن مارے پھر رہے تھے۔ فلسطین، جس میں شاید ہی کبھی وہ اطمینان سے رہ سکے ہوں، ان سے چھن چکا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں میں بدستور مقدس تھا۔ اور اس احساسِ تقدس کا مظہر وہ (PASSOVER) کی سالانہ ضیافت تھی۔ جہاں "آئندہ سال یروشلم میں" کا لفظی ورد کیا جاتا تھا۔ اس رسم میں اس امید کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ یہودی کسی نہ کسی دن، کسی نہ کسی طرح ہیکل سلیمان (TEMPLE OF SOLOMAN) کی از سرِ نو تعمیر کریں گے۔ یہودیوں کی یہ مقدس آرزو مستقل خطرہ ہے۔ کیونکہ ہیکل سلیمان کی جگہ مسجد عمرؓ استوار ہے۔ ایک کی تعمیر، دوسری کی تخریب ہے۔ عرب (مسلمان) کہ حضرت سلیمانؑ کو بھی اپنا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، سلیمان کے ہیکل کو اپنی مسجد سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک "ہیکل کی مسجد میں" "تبدیلی" نہ تخریب ہے نہ نئی تعمیر۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ سلسلہ مسلسل ہے۔ یہودیوں کے نزدیک تعمیرِ مسجد غصب ہے۔ وہ اسے برباد کر کے ہیکل کی تعمیر کے متمنی ہیں۔ یہ بنیادی فرق علت ہے اس نزاع خونین کی جس کی زد میں فلسطین ہے۔

مسلمانوں کی آمد

حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے عہد میں، یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کوئی چار ہی سال بعد ۶۳۶ء میں مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۱۷ء تک کہ جنرل ایلن بی نے ترکوں سے اسے فتح کر لیا۔ سوائے اس عرصہ کے کہ صلیبیوں نے لاطینی حکومت قائم کی، فلسطین پر ہمیشہ مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ دسویں صدی میں

عربی قوت و شوکت ان کی قبائلی عصبیت لہٰذا خانہ جنگی کے ہاتھوں کمزور ہو چکی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ترک ابھر رہے تھے۔ گیارھویں صدی میں سلجوقی ترک میسوپوٹیمیا پر حملہ آور ہوئے۔ اور خلیفہ وقت کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ گو بظاہر اسے خلیفہ ہی رہنے دیا۔ انہوں نے ۱۹۱۷ء تک ایشیا سے بازنطینی حکومت کا مکمل استیصال کر دیا۔ سلجوقیوں نے ۱۰۷۵ء کے قریب یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا اور تابوتِ مقدس کو تباہ کر دیا۔ اس غارت نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ پوپ نے مقدس صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی۔ تاکہ "کافر" ترکوں سے پورا انتقام لیا جائے۔ ایک ناکام کوشش کے بعد ۱۰۹۹ء میں، پاپائیانِ یورپ نے یروشلم پر حملہ کیا اور ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اسے فتح کر لیا۔ یروشلم کی گلیوں میں اس قدر کشت و خون ہوا کہ گھوڑوں کے ٹاپوؤں سے خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر سواروں پر پڑتے تھے۔ ۱۱۰۰ء میں لاطینی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۱۶۹ء میں غازی صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کے منتشر قوی کو مجتمع کیا اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۱۸۷ء میں مسلمانوں کا یروشلم پر قبضہ ہو گیا۔ مسیحیوں نے شکست کھا کر تیسری صلیبی جنگ کی طرح ڈالی مگر ناکام رہے۔ چوتھی صلیبی جنگ برائے نام تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوبی دور کے بھرپور وار کے بعد صلیبی بالکل نہیں سنبھل سکے۔ اور مسلمانوں کے مقابلہ میں پھر کبھی نہ آ سکے۔ اس کے بعد تاتاریوں کی ہلاکت سامانی کا سیلاب آیا اور گذر گیا۔ ازاں بعد ترکانِ عثمانی اٹھے جو یورپ میں بھی داخل ہو گئے۔ تھریس، بلغاریہ، مقدونیہ اور سرویا تک کو فتح کر لیا۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد خلافت کا اعلان کر دیا گیا جس کا الغا ۱۹۲۳ء میں مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جنرل ایلن بی کے ہاتھوں فلسطین انگریزی قبضہ میں چلا گیا۔ تاریخ کے ان نشیب و فراز میں فلسطین اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر فاتحین کی جنگ آزمائیوں کا میدان بنا رہا۔

صیہونیت

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے فلسطین سے نکل جانے کے بعد یہودیوں کی آبادی فلسطین میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ یہودی جو بے چارگی کے عالم میں پیچھے رہ گئے تھے وہ اسی حال میں رہ رہے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کہ یہ عرصہ مغربی قوائے استعمار کی خصوصی سرگرمی کا حامل ہے، بیرونی یہودیوں نے فلسطین میں قدرے دلچسپی لینی شروع کی۔ استعماریت کے پس منظر میں فلسطین کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیشِ نظر ناگزیر تھا۔ تمام قوتیں اس اہم مرکز پر تسلط جمانا چاہتی تھیں۔ یہودیوں کی موجودگی سے عرب کی اہمیت اور قبضہ کو کم کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ کچھ یہودی خریدی ہوئی زمینوں پر آباد ہو گئے اور اس طرح "نئی آبادیوں" کی طرح ڈالی۔ لارڈ راس چائلڈ اور دیگر امیر ترین یہودیوں کی بدولت سرمایہ کی کوئی کمی نہیں تھی بلکہ مسرفانہ خرچ کیا جا سکتا تھا۔ متواتر پروپیگنڈے اور خیراتوں سے بیرونی یہودیوں کو جو اطمینان سے اپنے اپنے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مطلقاً ترکِ وطن کے لئے تیار نہ تھے، ان کو رعب اور لالچ سے مجبور کیا گیا کہ وہ فلسطین جائیں زمینیں خریدیں اور نئی یہودی آبادیاں بسائیں۔ لارڈ راس چائلڈ اور دوسرے سرمایہ دار یہودیوں نے ان آبادیوں

کے قیام و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عالمگیر یہودی جدّوجہد کا چنداں خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہودیوں کا تناسبِ آبادی بمشکل پانچ فی صد تھا جو پہلی عالمگیر جنگ کے آغاز تک سات فی صد سے زیادہ نہ ہو سکا۔ اختتامِ جنگ پر ۱۹۱۹ء میں یہ تناسب دس فی صد تھا۔ گویا سرمایہ کے بے تحاشہ صرف کے باوجود فلسطین اختتامِ جنگِ اوّل تک مکمل عربی ملک تھا۔ کیونکہ عرب آبادی نوّے فی صد تھی۔

یہودی سرمائے اور پروپیگنڈے کو بین الاقوامی حالات نے کافی کمک پہنچائی۔ ۱۸۸۱ء میں روس اور رومانیہ میں آباد یہودیوں پر مظالم کا بے پناہ ریلا آیا۔ یہودی جارو ناچار ان ممالک سے نکل پڑے۔ ان تارکینِ وطن کی حقیر سی تعداد عازمِ فلسطین بھی ہوئی۔ ان دنوں یورپ میں ایک انجمن "محبانِ صیہون" (CHOVEVE ZION) قائم ہوئی جس نے یہودی تارکینِ وطن کا رُخ موڑنے کے لئے فلسطین بھیجنے میں خاصی سرگرمی دکھائی۔ ۱۸۹۷ء میں ایک آسٹروی صحافی (THEODOR HERZL) نے صیہونی سوسائٹی (ZIONIST SOCIETY) قائم کی۔ ہرزل کا مقصد یہ تھا کہ یہودی قومی اسٹیٹ میں اکٹھے ہو جائیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ایسی سٹیٹ فلسطین میں ہو۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ ۱۹۰۳ء میں جب برطانوی حکومت نے یوگنڈا (UGANDA) کو بطور موزوں یہودی سلطنت (قومی وطن) کے پیش کیا تو ہرزل نے اسے قبول کر لیا۔ البتہ جب یہ پیش کش صیہونی کانگرس کے سامنے آئی تو اس نے نامنظور کر دی۔ اس وقت ہرزل کا انتقال ہو چکا تھا۔ صیہونیت کا صدر مقام برلن تھا۔

یہودی استحقاق

فلسطین پر یہودی استحقاق بتایا جاتا ہے۔ اسی غرض سے ہم نے اوپر یہودی تاریخ کے اس حصہ کا سرسری جائزہ لیا ہے جو فلسطین سے متعلق ہے۔ اس مختصر سے تبصرہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہودی فلسطین پر ایک قلیل مدت کے لئے حکمران رہے۔ اس زمانہ اقتدار میں ہر چند انہوں نے مقامی باشندوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں صرف مغلوب کر سکے فلسطین سے ختم نہ کر سکے، نہ اکھاڑ پھینک سکے۔ اس مختصر دورِ حکومت کے علاوہ ان کی ساری داستان ذلّت و شکست اور تباہی اور بربادی کی داستان ہے۔ وہ ایک دفعہ فلسطین سے بے دخل ہوئے تو دو ہزار سال تک اس کی بازیافت کر سکنا تو درکنار اس میں معقول تعداد میں آباد بھی نہیں ہو سکے۔ ان کا فلسطین پر حق چند سالہ حکومت سے ہے۔ تاریخ و سیاست اوّل الذکر حق کو مطلقاً تسلیم نہیں کرتی۔ تاریخ ایک بھی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کوئی ملک کسی قوم کی تحویل میں اس لئے دے دیا گیا ہو کہ عہدِ ماضی میں وہ اس پر فرمانروا رہ چکی ہے۔ سیاست کا کوئی اصول اس دلیل لیے معنی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر یہ دلیل حقِ ملکیت کے حق میں دی جا سکتی ہے تو اس کا فائدہ عربوں کو ملنا چاہیئے، نہ کہ یہودیوں کو۔ فلسطینی (عرب) ہمیشہ فلسطین کے مالک رہے ہیں۔ وہ اس پر حکمران رہے ہوں، یا کسی اور قوم کے محکوم، وہ فلسطین کے مالک رہے، اسی سرزمین سے اٹھے اور اسی خاک میں مدفون ہوئے۔ ان کا جسمانی تعلق فلسطین سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ یہودیوں کو فلسطین بخش دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے پہلے ان سے چھینا جائے جو اس کے

جا رہے ہیں۔ لیکن عرب پورا کے پورا ہیں تو یہی کافی ہے کہ وہ اس ملک میں رہیں اور اس کے بدستور مالک رہیں۔ ان کے ہاں انتقالِ ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک فلسطین سے یہودیوں کی جذباتی وابستگی اور آئندہ سال یروشلم میں کی سالانہ رسم کا تعلق ہے اس کی حقیقت رسم ہی کے رسمی اعادے سے زیادہ نہیں۔ اب تک جو یہودی فلسطین میں آ کر آباد ہوئے ہیں، وہ، وہ ہیں جنہیں ان کے آبائی وطن سے نکال دیا گیا ہے۔ اور جنہیں صیہونی سوسائٹیوں نے مجبور کر کے فلسطین کی جانب دھکیلا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے یہودی ترکِ وطن کر کے فلسطین میں نہیں آ جاتے؟ کیا وہ ان یہودیوں کے مقابلہ میں جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنہوں نے فلسطین میں پناہ لی، کم ایمان دار یہودی ہیں؟ بات صاف ہے۔ چونکہ ان یہودیوں پر ظلم و تعدی نہیں ہو رہا، اس لئے "آئندہ سال یروشلم میں" ہر سال دہرانے کے باوجود اپنا ملک چھوڑ کر فلسطین جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ خود اس ہدایت نامہ اور دیگر سربرآوردہ یہودی فلسطین میں آ کر آباد نہیں ہوتے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فلسطین یہودیوں کا قلبی معاملہ نہیں، بلکہ خصوصی اغراض و مصالح سے انہیں عرب علاقوں پر ٹھونسا جا رہا ہے اور عربوں کو آبائی وطنوں سے نکالا جا رہا ہے۔ اس طرح ان بدبختوں کے لئے اور مصیبت پیدا کی جا رہی ہے۔ یہودیوں کو یوں فلسطین پر ٹھونسنا، حملہ کرنے کے مترادف ہے۔

یہودی استحقاق کی دوسری وجہ مذہبی ہے۔ حضرات موسیٰؑ اور عیسیٰؑ فلسطین کے پیغمبر تھے اور یہودی، اوّل الذکر کو اپنا قومی ہیرو تصور کرتے ہیں۔ یروشلم یہودیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ یہ دلیل دیتے وقت اس بیّن حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ خود عربوں کے لئے فلسطین اتنا ہی تقدس کا حامل ہے جتنا یہودیوں کے لئے۔ وہ پیغمبر جنہیں یہودی اپنا سمجھتے ہیں درحقیقت اسلام (لہٰذا مسلمانوں) کے پیغمبر ہیں۔ مسلمان ان پیغمبروں کا احترام ہی نہیں کرتے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی اس خاک کا ذرّہ ذرّہ مقدس ہے کہ وہ عروج و زوالِ اقوام کی الٰہی مشیّت کے پروگرام کا آئینہ بردار ہے اور ایمان و عمل کی بے نظیر تجربہ گاہ۔ مسلمان کی تاریخ فلسطین کے بغیر نامکمل ہے۔ مسلمان ہونے کے اس رشتۂ عزیز کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا اور اسے جان سے عزیز تر رکھا ہے۔ وہ اسے ہاتھ سے کیسے جانے دے سکتا ہے؟ یہودی اس رشتہ کو دو ہزار سال سے گم کر چکا ہے۔ وہ اسے ہاتھ میں لے سکتا ہے تو مسلمان کا سینہ چیر کر۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن مقامات پر مسلمان کا سینہ دونیم ہوا ہے وہ تاریخ کے فیصلہ کن مقامات تھے۔ آج ہم پھر ایسے ہی فیصلہ کن مقام پر ہیں۔ زندہ قوموں کا ہر مرحلہ ہوتا ہی فیصلہ کن ہے!

عرب

یہودی تاریخ کے سرسری جائزہ سے ان کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عربوں کی تاریخ دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ یوں بھی عربی تاریخ ایسا گم شدہ باب نہیں جسے کوشش سے نمایاں کیا جائے۔ البتہ رابطہ قائم کرنے کے لئے ہم مختصراً تازہ ابواب پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ترکوں کے دورِ حکومت میں عالمِ عرب پر عمومی طور پر جمود چھا گیا۔ ان کے بیداری کے آثار ۱۸۴۷ء سے شروع ہوتے ہیں جب اس

تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی جسے وہابی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز عرب سے محمد ابن عبدالوہاب نے کیا جس کا مقصد اسلام کو ان آلائشوں سے پاک کرنا تھا جو دمشق اور بغداد میں اس کا لازمہ بن چکی تھیں۔ چونکہ ترکی حکومت عربوں کے لئے سیاسی غلامی کا باعث سمجھی یا سمجھائی جانے لگی تھی، اس لئے بتدریج ان میں آزادی خواہی کے جذبات پیدا ہوتے گئے۔ وہابی جیسی اصلاحی تحریک نے بیداری کے آثار پیدا کئے تو سیاسی غلامی نے ان کا رخ سیاست کی طرف ہی پھیر دیا۔ ۱۸۷۵ء میں پانچ نوجوانوں نے مل کر بیروت میں ایک خفیہ سیاسی انجمن کی طرح ڈالی۔ ایسی خفیہ انجمنوں کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ترکی کے خلاف بھی ہونی گئیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی اقوام زندگی کی نئی تڑپ محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے فکری ارتقاء میں مادیت کو دخل تھا اور کئی ایک فلسفی وحشیانہ قوت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اقوام یورپ قومی تغلب کے نشہ میں بدمست ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے وقار کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں۔ ۱۸۶۰ء میں دمشق اور لبنان میں مسلم عیسائی فسادات ہوئے جن میں عیسائیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ان فسادات کو بہانہ بنا کر نام نہاد عیسائی سلطنتوں نے مشرق وسطیٰ کے امور میں دخیل ہونا شروع کر دیا۔ یورپی قوتوں کی یہ مداخلت بتدریج بڑھتی گئی اور غیر یورپی ممالک ان کی باہمی رقابتوں کی آماجگاہ بن گئے۔ برطانیہ برصغیر پر قابض تھا، وہ انگلستان سے برصغیر تک کا راستہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ بحرِ روم اور بحرِ قلزم کے سواحل اس کے لئے مخصوص فوجی اہمیت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے ۱۸۸۲ء میں مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے الجیریا (۱۸۳۰) اور ٹیونس (۱۸۸۱ء) پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے بھی مشرق وسطےٰ پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اٹلی نے بحرِ روم کو رومی جھیل بنانے کے قصد سے لیبیا کی رگِ جان میں اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے۔ یہ سلسلہ جنگِ عالمگیر تک جاری رہا اور ممالکِ اسلامیہ استعمارِ فرنگ کا یا براہِ راست شکار ہو گئے یا بالواسطہ اس کے زیرِ اثر آ گئے۔

اندرونی خرابیوں اور بدنظمیوں اور مغربی قوائے کی ریشہ دوانیوں کے طفیل ترکی، مردِ بیمار، بن چکا تھا۔ ترکی اب تک خلافتِ اسلامیہ کا حامل تھا۔ اس کے دم سے بظاہر ممالکِ اسلامیہ ایک مرکز سے وابستہ تھے۔ یہ وابستگی جذباتی تھی۔ لیکن سیاست نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف شکایات تھیں۔ ترک اندرونی اور بیرونی مصائب میں مبتلا تھے۔ اس پر مستزاد استعمار کا سیلاب اور قوائے مغرب کی باہمی رقابت تھی۔ آتش فشاں پہاڑ بالآخر پھوٹا، اور ۱۹۱۴ء میں جنگِ عمومی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ترکی جنگ میں جرمنی اور آسٹریلیا کا حلیف بنا۔ خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے سلطان ترکی نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا اثر شام یا ممالکِ عربیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ برصغیر کے مسلمانوں تک بھی تھا۔ برطانیہ کے لئے یہ عظیم الشان خطرہ تھا جس کا سدِّباب اشد ضروری تھا۔ کچنر کی سیاسی پیش بینی کو اس خطرہ کا احساس جنگ سے

پہلے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ فروری سنہ ۱۹۱۱ء میں وہ حسین ابن علی، شریف مکہ سے، اس کے دوسرے بیٹے عبداللہ کی معرفت مل چکا تھا۔

عرب اور برطانیہ

عرب، خود متفرق اور غیر منظم تھے۔ حسین، شریف مکہ، اپنی خلافت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ترکی کے خلاف انگریز سے سازش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عربوں پر اسے یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ وحدتِ عربیہ پر جمع ہو جائیں گے۔ اس کا دوسرا بیٹا عبداللہ پر امید تھا۔ وہ والد کی طرف سے کچن، سٹارس اور بعد میں سر ہنری میکموہن سے مصروفِ گفتگو رہا۔ حسین کا تیسرا بیٹا فیصل ترکی کی معاونت کو ترجیح دیتا تھا، تاکہ اس پر احسان کر کے معاہدۂ امن میں کچھ حاصل کیا جائے۔ حسین نے عبداللہ سے اتفاق کیا۔ بقول لارنس، حسین، فیصل سے متنفر بھی تھا۔ چنانچہ حسین نے انگریزوں سے مذاکرات جاری رکھے۔ اس کے ساتھ اس نے انفسطاط، الاخضر جیسی انقلابی جماعتوں سے بھی مراسم قائم کر لئے۔ کیونکہ وہ ترکوں کے خلاف کہیں زیادہ باغیانہ سرگرمی دکھا رہی تھیں۔ جنگ جاری رہی۔ انگریز، ترکوں اور جرمنوں کے ہاتھوں .... پیہم شکستیں اٹھا رہے تھے۔ اب موقع تھا کہ تمام عرب کو ترکوں سے علیحدہ کیا جائے اور اپنے زیر اثر کیا جائے تاکہ انہیں ترکوں کے خلاف صف آرا کیا جا سکے۔ ایسے میں رہو ... خالم میکموہن مراسلت کا آغاز ہوا۔ میکموہن مصر میں برطانوی ہائی کمشنر تھا۔

حسین کا مطالبہ عرب آزادی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عربی حکومت کی مغربی سرحد بحر قلزم اور بحر روم تک ہو۔ اس تحدید میں عرب، عراق، شرق اردن، فلسطین اور شام شامل تھے۔ میکموہن نے اسے تسلیم کرتے ہوئے ان اضلاع کو نکال دیا جو دمشق، حمص، حماد اور حلب کے مغرب میں واقع تھے۔ کیونکہ وہ علاقے خالص تاعربی نہ تھے۔ اس "مغرب" کی بعد میں یہ توجیہہ کی گئی کہ اس سے فلسطین عربی سلطنت کی حدود سے خارج ہو گیا تھا۔ خود میکموہن نے ایک مرتبہ لندن ٹائمز میں لکھا کہ جن علاقوں سے متعلق وعدے کئے گئے تھے ان میں فلسطین شامل نہیں تھا۔ یہ قطعی غلط ہے اس لئے کہ میکموہن نے عربی سلطنت کی حد بحر روم تک تسلیم کر لی تھی۔ اس سے فلسطین خود بخود عربی حکومت میں آ جاتا تھا۔ اگر بالفرضِ استدلال اس شرط کو ساقط سمجھ لیا جائے تو نقشہ پر دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فلسطین دمشق کے مغرب میں نہیں بلکہ جنوب مغرب میں ہے ایسی دراز کار اور احمقانہ توجیہیں برطانوی سیاست کا لازمہ ہیں۔ خود پاکستان کو ان کا کس قدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ فلسطین کو خارج کرنے کی ایک اور ایسی ہی لچر دلیل دی جاتی ہے۔ میکموہن نے ایک شرط یہ لگائی تھی کہ عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں برطانیہ فرانس کے مفاد کے منافی اقدام نہیں کرے گا۔ فلسطین میں فرانس کا مفاد کچھ بھی نہیں تھا۔ لہٰذا یہ شرط فلسطین کے معاملہ میں ساقط العمل ہو جاتی ہے۔ یوں بھی فلسطین عربی ملک تھا، اس کی عرب آبادی

نوّے فیصدی تھی۔ اس کے اخراج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلسطین کو نکال کر عربی حکومت اور وحدتِ عربیہ کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا تھا۔ ایک حلقہ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ چونکہ انگریز نے فلسطین کو فتح کیا تھا اس لئے اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کا کچھ بھی "استعمال" کرتا۔ قومیں جائیدادیں نہیں ہوتیں کہ ان پر حقِ ملکیت تسلیم کیا جائے اور جسے جی میں آئے ان کا استعمال کیا جائے۔ بیسویں صدی کی مہذّب دنیا میں اس متروک و مردود نظریّہ کو اساسِ گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ طرزِ استدلال غمازی کر رہا تھا کہ فرنگی ذہن سیاسی استبداد و ظلم سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ ایسے حضرات نے ایبی سینیا پر اٹلی کا حقِ ملکیت کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ انہوں نے چین کے مفتوحہ علاقے میں جاپان کا حق تسلیم کیا۔ اٹلی اور جاپان کے خلاف ان کی دی ہوئی دلیلیں خود ان کی تردید اور تغلیط کے لئے کافی ہیں۔

کرنل لارنس نے جنگ کے دوران عربی جذباتِ وطنیت کو ابھارنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ایلن بی نے اکتوبر ۱۹۱۷ء میں جب فلسطین میں جارحانہ کارروائی شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریز ایک حلیف ملک میں لڑ رہے ہیں اور ترک دشمن ملک میں ہیں۔ عرب سپاہی ترک فوجوں سے بھاگ بھاگ کر آ رہے تھے۔ اور ترکی فساکہ کا سلسلۂ رسد و رسائل درہم برہم ہو رہا تھا۔ ایلن بی کے الفاظ میں عرب کی امداد "بے بہا" تھی۔ لائڈ جارج نے مؤتمرِ امن (۱۹۱۹ء) میں اعتراف کیا۔

> شاہ فیصل نے اپنے تمام ذرائع ہمارے سپرد کر دیئے جس سے ہم کو مادی طور پر سب سے زیادہ مدد ان فتوحات میں ملی۔

جنگی امداد کے علاوہ عربوں نے انگریز کو کامیاب و فاتح بنانے کے لئے کیا کیا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگائیے:۔

> ان (عربوں) کے گھر کی ایک ایک چیز خوراک، خریدنے میں صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ ان کی چھتوں کی ٹائلیں بھی بکنا شروع ہو گئی تھیں ..... (یہ حالت جو لائی ۱۹۱۷ء کی ہے) پندرہ ماہ بعد جب بیروت فتح ہوا ہے تو حالات اور بگڑ چکے تھے۔ یہ کہنا شک و شبہ سے مبرّا ہے کہ جنگ کے دوران تین لاکھ شامی فاقوں مر گئے۔ صحیح شمار ساڑھے تین لاکھ کا ہے۔ کوئی تین ہزار جیلوں میں جھونک دیئے گئے جن میں سے بیشتر نذرِ اجل ہو گئے۔ شام کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پانچ لاکھ کے لگ بھگ جنگ میں کام آئی۔ (THE ARAB AWAKENING)

عربی آزادی

عرب مسلمان تھے۔ انہوں نے ترکی دعوتِ جہاد کی کیوں پروا نہ کی؟ لارنس کے الفاظ میں:۔

> دورانِ جنگ میں عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت اس لئے نہیں تھی کہ ترکوں

کی حکومت خراب تھی، بلکہ اس لئے کہ عرب آزادی چاہتے تھے۔ انھوں نے جنگ کی آگ میں اپنی جانیں اس لئے نہیں جھونکیں تھیں کہ وہ آقاؤں کی تبدیلی کریں اور برطانوی رعایا بن جائیں یا فرانسیسی شہری، بلکہ وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔

(لارنس کے خطوط)

ترکوں کے دور نے عربوں میں بڑی حد تک جذباتِ قومیت و آزادی پیدا کر دیئے تھے۔ انگریز نے اس کا فائدہ اٹھایا اور عربوں کو آزاد عربستان کا سبز باغ دکھایا۔ عربوں کا اس دام میں آجانا عہدِ ماضی کا قدرتی نتیجہ تھا۔ ترکی اور جرمنی اتحاد کی شکست کی واحد صورت یہی تھی کہ مشرقِ وسطیٰ سے ان کو بے دخل کر دیا جاتا۔ اپنی اہمیت کے پیشِ نظر مشرقِ وسطےٰ جنگ کے نتیجہ کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ انگریز نے یہیں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ انگریز کی وسیع سلطنت کے لئے مشرقِ وسطےٰ خصوصیت سے اہم تھا۔ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنے کے لئے انگریز نے کمال فراخدلی سے ان سے وعدے کئے۔ چونکہ مقصد عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کرنا تھا، اس لئے وعدوں کی معقولیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں انگریز نے ہر اس چیز کا وعدہ کیا جو وہ کر سکتا تھا اور جس کا نتیجہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنا ہو سکتا تھا۔

عربوں کی شرکتِ جنگ، وطنی آزادی کی خاطر تھی اور انگریز نے اس کا حتمی وعدہ کر رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے قول میں کس قدر مخلص تھا، اس کا اندازہ اس وقت کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ میکموہن نے اگست ۱۹۱۵ء میں حسین کو لکھا:-

> لارڈ کچنر نے جو اعلان علی آفندی کی معرفت آپ تک پہنچایا ہے جس میں ہماری ممالکِ عربیہ اور ان کے باشندگان کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

خفیہ معاہدہ

مئی ۱۹۱۶ء میں جب عرب یقینی طور پر انگریزوں کے حلیف بن چکے تھے۔ برطانیہ اور فرانس میں ایک خفیہ معاہدہ (SYKES PICOT AGREEMENT) طے ہوا۔ اس معاہدہ میں ہر چند برطانیہ (اور فرانس) کے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ وہ ایک آزاد عرب حکومت یا مغربی دفاق کے موید ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے معاہد ممالکِ عربیہ کو حلقہ ہائے اثر (برطانوی اور فرانسیسی) میں تقسیم کرنے میں اتفاق کر لیا۔ اس معاہدہ کی رُو سے فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے! معاہدہ عربی ممالک سے متعلق ہو رہا ہے اور عربوں سے انگریز کے حتمی مواعید موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فرانس سے یکطرفہ معاہدہ کر لیا جاتا ہے جو اس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے جو عربوں سے کیا جا چکا تھا۔ اگر سائیکس، پیکٹ معاہدہ برطانیہ کے سابقہ مواعید کے مطابق تھا تو اسے حسین سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا؟ کیا یہی بات شک کے لئے کافی نہیں تھی؟ استعمارِ فرنگ کی یہ بداخلاقی اور بددیانتی بین الاقوامی سیاست کا طرۂ امتیاز ہے اور بین الاقوامی مسائل کی کہ ان میں سے اہم

فلسطین ہے، علت العلل ہے، روسی حکومت نے اس خفیہ معاہدہ کو شائع کر دیا۔ اور حسین نے فوراً میکموہن کو اس کے متعلق لکھا تو میکموہن نے اسے ترکی کی شر انگیز کوشش قرار دیتے ہوئے عربوں کی یوں تشفی کی کہ برطانیہ پہلے کی طرح عزم مصمم کئے ہوئے ہے کہ وہ وحدت و استقلالِ عربیہ کی تشکیل و تقویم کرے گا۔ انگریزوں کی اس منافقت کا انکشاف ہونے سے عربوں کے ایک حلقہ میں نہ صرف انگریز سے متعلق بلکہ خود حسین کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ چنانچہ سات عرب زعماء نے برطانیہ کو ایک یادداشت بھیجی جس کے جواب میں وزارتِ خارجہ (برطانیہ) نے (THE DECLARATION TO SEVEN) شائع کیا۔ اس اعلان میں پھر اعادہ کیا گیا۔

> جن عربی ممالک پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کیا ہے، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ان ممالک کی آئندہ حکومت متعلقہ باشندوں کی رضامندی سے تشکیل پذیر ہو۔ جو علاقے ابھی تک ترکوں کے قبضہ میں ہیں، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی خواہش ہے کہ ان علاقوں کے غیور باشندے خود مختاری اور آزادی حاصل کریں۔ ملک معظم کی حکومت اس مقصد کی تکمیل میں بدستور کوشاں رہے گی۔

۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو فلسطین، شام اور عراق کے کونے کونے میں ایک اعلان چسپاں کرایا گیا جس میں تحریر تھا:۔

> مشرق وسطیٰ میں جرمنی نے جس جنگ کی طرح ڈالی ہے اس میں شریک ہوتے ہوئے برطانیہ اور فرانس کے پیشِ نظر مقصد ان لوگوں کی مکمل اور حتمی آزادی (COMPLETE AND FINAL LIBERATION) ہے جو اب تک ترکوں کے غلام چلے آئے ہیں نیز ایسی قومی حکومتوں کی تشکیل جو مقامی باشندوں کے آزادانہ انتخاب و فیصلہ کا نتیجہ ہوں گی برطانیہ اور فرانس کسی قسم کا بھی نظام حکومت اپنی طرف سے مسلط نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ ایسی مؤثر امداد دیں گے جس سے وہ حکومتیں بخوبی چل سکیں۔

عربوں سے ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ وعدے ہوئے کہ ایک عرب ریاست یا عربی ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے گا۔ لیکن موتمر امن اور اس کے مابعد عربوں کو تقسیم اور تقسیم در تقسیم کے سوا کچھ نہ ملا۔ سیریا کو شام، لبنان، فلسطین، عراق اور شرقِ اردن میں تقسیم کر دیا گیا۔ بقیہ شام کو آزادی نہیں دی گئی بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ انتداب قبول کرے۔ انتداب ایک "بدعت" تھی جو جمعیتِ اقوام نے پیدا کی۔ نہ اس کا عربوں کی طرف سے مطالبہ ہو سکتا تھا، نہ انگریزوں کی طرف سے وعدہ۔ وعدہ خالص آزادی کا تھا جسے پہلو بدل بدل کر ٹالا گیا۔ عراق حسین کے بیٹے، فیصل کو بخش دیا گیا۔ شرقِ اردن اس کے بیٹے عبداللہ کو۔ شام، فرانس کے انتداب میں دے دیا گیا اور فلسطین برطانیہ کے انتداب میں۔ کیا یہ فیصلے ان وعدوں کے مطابق تھے جو جنگ کے دوران عربوں سے کئے گئے تھے؟ کیا عربوں کا مطالبہ انتداب کا تھا؟

کیا یہ نئی حکومتیں مقامی باشندوں کی رضامندی سے متشکل ہوئی تھیں؟ عراق نے انتداب کی مخالفت کرتے ہوئے بامرِ مجبوری امریکی انتداب کو ترجیح دی، لیکن اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں مقامی باشندوں کے ان مطالبات و حسیات کو ٹھکرا دیا گیا جس کے احترام کے حتمی اور مکرر وعدے موجود تھے۔ لارنس لکھتا ہے:۔

فرانس نے دیوانہ وار انتداب بدلنے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے شرمناک سودا کر کے اس (فرانس) کی تائید کی، تاکہ وہ میسوپوٹیمیا حاصل کر سکے۔ س۔ پ ــــ معاہدہ کی رُو سے فرانس کو ساحل ملا اور عربوں کو حلب، حما، حمص، دمشق اور شرقِ اردن۔ انتداب کے صدقے ہیں اکثر و بیشتر حصے انگلستان اور فرانس نے ہتھیا لئے۔ س۔ پ معاہدہ تحدید میں احمقانہ تھا مگر اس میں شام کا حقِ مختاری تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ (معاہدہ) آئندہ فیصلے سے دس ہزار گنا بہتر تھا۔

(باقی آئندہ)

ایک اور چراغ گُل ہو گیا!

۱۷ اگست کو راولپنڈی سے آمدہ ایک تار سے یہ جانکاہ خبر ملی کہ چوہدری نجابت خان صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ گذشتہ سال مرحوم پر حج کے دوران سن سٹروک کا شدید حملہ ہوا تھا اور انہیں اسی معذوری کی حالت میں واپس وطن لایا گیا تھا۔ یہاں آ کر انہوں نے اس مرض کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ کبھی صحت قدرے بہتر ہو جاتی تھی اور کبھی پھر مرض کا حملہ ہو جاتا تھا۔ بالآخر مرض نے غلبہ پا لیا اور مرحوم ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

مرحوم کی طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر سے قلبی وابستگی تھی اور وہ عرصہ دراز تک بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی کی نمائندگی کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ تاآنکہ وہ صحت کی انتہائی خرابی کی وجہ سے بالکل معذور نہیں ہو گئے۔ وہ بڑے فعّال اور گرم جوش کارفرما تھے، اور تحریک کے پروگراموں میں بڑی کشادہ ظرفی سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ افسوس کہ موت کے ہاتھوں ایسا پُرجوش رفیق ہم سے چھن گیا۔ اس سے تحریک میں بالعموم اور بزمِ راولپنڈی میں بالخصوص جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ ادارہ (بالخصوص پرویز صاحب) بزمِ راولپنڈی کے اراکین اور مرحوم کے پس ماندگان کے ساتھ اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق۔

غم زدہ

میرزا محمد خلیل

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

سربستہ حقیقتیں بے نقاب — اسرار و رموز واشگاف

پرویز صاحب متعارف تو مفکرِ قرآن کی حیثیت سے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کون کونسی ہوش رُبا وادیوں اور حیرت فروش منزلوں سے گذر کر اس چشمۂ نور و حیات تک پہنچے ہیں۔ ان کا بچپن، تصوف کے خواب آور گہوارہ میں گذرا۔ جب ان کے شعور نے آنکھ کھولی تو ان کے دل میں خلش پیدا ہوئی کہ معلوم کیا جائے کہ تصوف کی اصل و بنیاد کیا ہے۔ جسے مشاہدۂ حقیقت کہا جاتا ہے اس کی کنہ و ماہیت کیا ہے۔ واردات قلبی کا سرچشمہ کونسا ہے۔ مختلف ریاضتوں اور مراقبوں سے جو کیفیت حاصل ہوتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ تعویذوں اور گنڈوں میں اثر کیسے پیدا ہوتا ہے۔ کرامات کس طرح سرزد ہوتی ہیں۔ یہ، اور اسی قسم کے سینکڑوں سوالات ان کے سینے میں اُبھرے جن کے حل کی تلاش میں وہ برسوں صوفیائے کرام کی درگاہوں اور خانقاہوں۔ ہندو سادھوؤں کی سمادھیوں اور سنیاسیوں کے یوگ آشرموں میں سرگرداں رہے اور اس طرح جو کچھ پڑھا تھا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جو کچھ سنا تھا اس کا ذاتی مشاہدہ کر لیا۔ ان واردات و مکاشفات کا علم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ دانشِ نورانی (کتاب اللہ) کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہوئے۔

اب انہوں نے اپنی ان آستاں نوردیوں اور خانقاہ پیمائیوں کی سرگذشت اور خود تصوف کی تاریخ کو اپنے مخصوص دلآویز انداز میں، اپنی اہم تصنیف

تصوّف کی حقیقت

میں منضبط کر دیا ہے۔ اس کے دو باب ہیں — اوّل، تصوف اور اسلام — دوم، تصوف اور اقبالؒ — مستور حقیقتوں کا آئینہ، اور سربستہ رموز و اسرار کا گنجینہ — کتابت، طباعت کاغذ عمدہ — جلد مزین اور مطلّا — ضخامت چار سو صفحات سے زائد۔ قیمت -/۲۵ روپے (محصولڈاک -/۵ ")

ملنے کا پتہ:

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ - لاہور (۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور